آر۔پی۔شوخ

ملنے کا پتہ ـــــ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، ای۔ آر۔ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲
سید شمیم احمد، ۲۱۷۰، احاطہ کالے صاحب، قاسجان اسٹریٹ، دہلی ۶

سرورق وڈزائن ـــــ سریندر بانسل
تعاون ـــــ عبد الرب
آفتاب رقم ـــــ سید مختار الزماں بخاری
تعداد ـــــ پانچ سو
قیمت ـــــ پچاس روپے
اشاعت ـــــ نومبر ۱۹۸۶ء
طباعت ـــــ لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی

 Deptt. of English M.N. College, Shahabad Markanda Haryana-132135.

اُرلچی شوخ

دَرد کو اپنی غذا، اشک کو پانی کہیے

وہ اگر زخم بھی دے رزق رسانی کہیے

دردِ اُٹھ اُٹھ کے یہ کہتا ہے رگِ جاں کے قریب
ابھی زنداں میں ہُوں لیکن درِ زنداں کے قریب

آگ جنگل بھری نیندوں میں لگانے والے
تم بھی آنا نہ مرے خوابِ پریشاں کے قریب

خشک آنکھوں میں ترے خواب بساؤں کیسے
کوئی چشمہ بھی ضروری ہے بیاباں کے قریب

سردیوں کی یہ خنک دھوپ بھی پگھلانے لگی
جیسے بیٹھا ہُوں اُسی شعلہ بداماں کے قریب

آنکھ کھُلتے ہی نہ وہ تھا نہ چراغاں نہ خُمار
رات گذری تھی کسی چاندسے مہماں کے قریب

ڈوب جاتا ہوں میں ہر صبح اُفق میں دِل کے
شہرِ جاناں سے پرے شہرِ خموشاں کے قریب

زندگی ہے کوئی زِندانی ہے ، کیا ہے رقصاں
کوئی مجھ میں ہے کہ زنجیر بہ پا ہے رقصاں

رات آئی کہ سجائی ہے تری یاد نے بزم
چاند نکلا کہ ترا درد ہُوا ہے رقصاں

وہی موتی سے لُٹاتا ہے بساطِ دِل پر
اُس نے ہی آنکھ میں گوہر سا کِیا ہے رقصاں

بڑی رونق تھی غمِ جانِ تمنّا تجھ سے
ترے ہوتے غمِ دُنیا بھی رہا ہے رقصاں

مرے حصّے میں بہاروں کی عزاداری تھی
آج گُلشن ہے نہ نغمہ نہ صبا ہے رقصاں

دیکھنا یہ ہے کہ ہے کون غزل خواں اب بھی
آج ہر شہر میں نفرت کی ہوا ہے رقصاں

کٹھنِ شب تھے، رہا شغل سحر ہونے تک
سر پٹکنا اِسی دیوار میں در ہونے تک

اُس کی عادت تھی مرے خون کو پانی کرنا
رنگ کیا کیا نہ اُڑا آنکھ کے تر ہونے تک

اب دوا ہے، نہ دُعا ہے، نہ مسیحا گویا
ہر خدائی تھی مرا خونِ جگر ہونے تک

عُمر بھر پھر ہے جُدائی کو محبّت کہنا
دیکھنا بھی ہے زمانے کی نظر ہونے تک

اپنی آہیں ہی سُبک گام نہ ہونے دیں گی
پا بہ زنجیر چلو ختم سفر ہونے تک

شہر کا شہر ہُوا اب تو تعاقب میں مرے
تیرا جادو بھی تھا مُجھ خاک بسر ہونے تک

یہ تو میں تھا کہ تراشا ہے ہر اک زخم سے پھُول
ہاتھ کٹ جاتے ہیں ناخُن میں ہُنر ہونے تک

یہ اِتّفاق تھا میں اُس کا ہم زمانہ تھا
جو زندگی سے تعارُف تھا غائبانہ تھا

کہیں مِلے تو کبھی عُمرِ رفتہ سے پوچھوں
کہاں ہے آج تِرا جس سے دوستانہ تھا

بنا کے اب مجھے ایندھن جلائے جاتا ہے
یہی تھی شاخ کبھی جِس پہ آشیانہ تھا

کبھی جو زُعم ہُوا وقت رہ گیا پیچھے
نظر اُٹھائی تو دیکھا وہی زمانہ تھا

کہاں تھی کوئی سماعت مکیں وہاں تو فقط
جبینِ سائی کی خاطر اِک آستانہ تھا

کبھی غزال سی خُوئے گریز ہی نہ گئی
تھی قُربتیں تو بہت ایک شاخسانہ تھا

تب تھا غم، مجھ میں تھی تیری آرزو صحرا نورد
اب مجھے یہ دکھ ہے میرے ساتھ تو صحرا نورد

چشمۂ دیدارِ یار آئے تو آئے دم میں دم
جانِ بلب کب سے ہے پیاسی جستجو صحرا نورد

اب تو کہتا ہوں اسی سے کر مجھے سرسبز کچھ
ہے بدن کے ریگ میں جو کچھ لہو صحرا نورد

سوچتا ہوں شہر کی راہوں میں لاشیں دیکھ کر
اس سے بہتر تھا کہیں بے سمت و سو صحرا نورد

میں کہ اب مرجھا گیا ہوں مجھ پہ رونا بھی عبث
کیا کرے گی ہو کے اب یہ آبجو صحرا نورد

اک نسیم صبح کو بھی کر دیا آتش بہ پا
زیست ہے اب دوزخی دنیا میں لو صحرا نورد

اُس میں جھانکا تو جو اپنا تھا لگا اور کوئی
وہ تو کہئے نہ ہوئی دل سے خطا اور کوئی

آن کی آن میں اِک یار پُرانا بدلا
نہیں بیتا سے بڑا شخص کُشتا اور کوئی

پہلے جیسا نہ رہا تُو تو سمجھ میں آیا
آج تک کرتا رہا ہم سے وفا اور کوئی

ہیں وفا پیشہ مگر کِتنے جُدا ہیں ہم تم
تو مرے دل کا خُدا تیرا خُدا اور کوئی

پھر تو اُس کو بھی نہ چاہا ہمیں چاہا جس نے
تجھ سے رنجش تھی، جیالے کے سزا اور کوئی

میرا رُتبہ تھا کچھ ایسا کہ میں رو بھی نہ سکا
مجھ سا دُنیا میں نہ ہو دُکھ سے بڑا اور کوئی

جسم کا گھر ہی گرا ہے تو نہ جاں ٹھہرے گی
یاد آئی بھی کسی کی تو کہاں ٹھہرے گی

تھک کے بیٹھا ہوں مگر زندگی بھاگی جائے
میں چلا جاؤں گا تو عُمرِ رواں ٹھہرے گی

اُس کے در سے جو اُٹھے شہر سے پھر کیا مطلب
کسی صحرا میں ہی اب نقلِ مکاں ٹھہرے گی

بھُول کر بھی نہ بھُلانا اُسے لے دِل ورنہ
یہ سُبک دوشی بھی اِک بارِ گراں ٹھہرے گی

خُود پہ ہر رُت کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا مگر
کیا خبر تھی کہ یہیں ایک خزاں ٹھہرے گی

دِل بڑے شوق سے برباد ہُوا کرتا تھا
تبؔ کِسی غمزے کا اِرشاد ہُوا کرتا تھا

ایسی پتھر ہُوئیں آنکھیں کہ نہ پھوٹیں آنسو
درد تیرا کبھی فرہاد ہُوا کرتا تھا

یہ کھنڈر چہرہ ہمیں یاد دِلائے کہ یہاں
اِک مسرّت کدہ آباد ہُوا کرتا تھا

ابؔ تو بے رنگ ہے دُنیا سے شکایت میری
کبھی تُو شامِلِ فریاد ہُوا کرتا تھا

کیسے دُنیا کو کہوں اُس کے مُشابہ وہ تو
اصطلاحاً سِتم ایجاد ہُوا کرتا تھا

اُس کو برسوں بعد تنہا جاننے میں کیسا لگا
مُجھ کو تو وہ اجنبی کے ساتھ بھی اچّھا لگا

ایک مُدّت سے نہ دیکھا تھا اُٹھا کر اُس کا غم
اُس کا غم بھی گرد میں لپٹا ہُوا تحفہ لگا

تھی لکھائی بھی اُسی کی دستخط بھی اُسکے تھے
کیوں خطِ ترکِ تعلّق غیر کا لکّھا لگا

ساحلوں پر بن سکا اُس سے نہ کچھ رشتہ مگر
اُس نے چھوڑا جب بھنور میں وہ مجھے اپنا لگا

میں کہ میری عُمر گذری انکسار و عِجز میں
کچھ مشینوں کو خطا کرتا ہُوا بچّہ لگا

وہ میرا سانس مگر اُس کو واسطہ بھی نہیں
کھنچا کھنچا ہے وہی جس سے فاصلہ بھی نہیں

سفر میں ساتھ مرے کچھ تو تھا سکوت سہی لیکن
جرس اب آہ کی، سانسوں کا قافلہ بھی نہیں

مزاجِ یار جو بگڑے تو حادثہ ٹھہرے
ہماری جان بھی جائے تو واقعہ بھی نہیں

وہ چھوٹتا ہے تو راحت نصیب ہوتی ہے
مری ہنسی مرے پاؤں کا آبلہ بھی نہیں

تمہارے نام ہوئی جب رقم غزل بھی ہوئی
یہ زندگی جو کہ ہونے کا ترجمہ بھی نہیں

نشتر آئے ہیں تنگ درماں سے
خون ہووے تو نکلے مژگاں سے

زندگی کا تو خون کر ڈالا
کیا نکالو گے اب رگِ جاں سے

سوچتا ہے کہ ساتھ دے کہ نہ دے
خود ہی نکلے گا اپنے زنداں سے

بجھتی جاتی ہے آندھیوں میں حیات
کس کو دیکھوں چراغِ لرزاں سے

ہر نگر قتل ہر گلی شبِ خوں
لوٹ آئے نہ وہ بیاباں سے

جس چکا چوند میں وہ بچھڑا تھا
اب تک اندھا ہوں اُس چراغاں سے

کسی بستی میں نہ پھر شہر نہ گاؤں میں رہا
تیرا درویش تہِ درد کھپاؤں میں رہا

میں وہ پیغامِ زبانی جو نہ پہنچایا گیا
زیرِ لب حرف جو کم سنتی ہواؤں میں رہا

اُس نے چھوڑا بھی تو پہنچا کے فلک پر چھوڑا
تنِ تنہا مَیں بلندی کے خلاؤں میں رہا

ہم نے تو اُس کی فقط قوسِ قزح ہی دیکھی
برق پارہ تھا کہ بادل سی قباؤں میں رہا

تیز اُڑتا ہُوا اِک رنگ رہا میرا وجُود
کیا کہوں اب مَیں تری دھوپ کہ چھاؤں میں رہا

اِک اِک نفس کی موت کو کب تک جیوں گا مَیں
یہ زندگی رہی تو نہ ہرگز بچوں گا مَیں

روتا ہُوں اب تو سوچ کر اُس کے عذاب کو
وہ شخص جس کی آنکھ سے ہو کر بہوں گا مَیں

الزام ہوں کسی کی نِگہ پر لگا ہُوا
اب دیکھنا یہی ہے کہ کیسے اُٹھوں گا مَیں

نکلی بیاضِ عُمر دریدہ ورق ورق
سوچا تھا صفحہ صفحہ اُسے ہی لکھوں گا مَیں

کھنچنے لگے ہیں چاروں طرف کالے حاشیے
اُس کو ملے گی جب یہ خبر چھپ چکوں گا مَیں

ماتھے پہ پڑی زُلف گِرہ گیسُو ہلا دی
کیوں تم نے دلِ خُفتہ کی زنجیر ہلا دی

ویسے تو مرے عشق کا ہر نقش حسیں تھا
جب درد نے کھینچی تو یہ تصویر ہلا دی

خط بھیج دِیا کاٹ کے پیمانِ ملاقات
یہ کون ہے جس نے تری تحریر ہلا دی

یُوں ہی نہ سمجھ اہلِ محبّت کے جُنوں کو
کم بخت نے جب چاہا ہے تقدیر ہلا دی

وہ زلزلہ گو روز ہلا دیتا تھا دِل کو
اِس بار مگر ساری ہی تعمیر ہلا دی

وہ گیا جس نے خزاؤں کے حوالے مُجھ کو
اُس سے کہتا ہُوں کہ شاخوں سے لگالے مُجھ کو

اُس نے روکا نہ مُجھے جب کہ میں دریا بھی نہ تھا
اب یہ کوشش کہ سمندر سے نکالے مُجھ کو

اب کہ پگھلا ہی دیا اُس نے یہ کچّا سونا
اب کسی ہار کے سانچے میں بھی ڈھالے مُجھ کو

میں بھی مُبہم ہُوا اب اُسکی محبّت کی طرح
جیسا چاہے ہے وہ ویسا ہی بنالے مُجھ کو

اِس کڑی دھوپ میں بھی چھوڑ گیا چاند وہی
جس نے بخشے تھے اندھیروں میں اُجالے مُجھ کو

پہلے آنکھوں نے کسی نرگسِ بیمار سے پی
پی گئے پھر مری آنکھوں کے پیالے مُجھ کو

میں بھی طے کر تو گیا تپتی زمینوں کا سفر
مِلے منزل کی جگہ پاؤں کے چھالے مُجھ کو

یہ حادثہ ہے مگر اُس طرف ہُوا کبھی نہیں
جُدا ہُوا بھی تو اُس سے جو جاتا کبھی نہیں

کبھی تو سوچ تجھے کتنا سوچتا ہو گا
وہ غمزدہ جو تری سمت دیکھتا کبھی نہیں

یہ دِل نے رُوٹھ کے کِن مشکلوں میں ڈال دیا
اُسی کو چاہنا اور اُس سے بولنا کبھی نہیں

ہمیں تو نیند میں سپنوں کی بھی مَناہی ہے
دریچے بند بھی رکھنے ہیں جھانکنا کبھی نہیں

نِگہ کا گھر سے نِکلنا تھا جُرم پہلے ہی
اور اب یہ حُکم ہُوا ہے کہ سوچنا کبھی نہیں

یہ جو نظروں کو جُھکا رکھا ہے
حادثہ ہے کہ ہُوا رکھّا ہے

یُوں تو غمزے ہیں مُقفّل لیکن
چور دروازہ کھُلا رکھّا ہے

سینۂ وادی پہ پربت بھی بجا
اُس نے تو حشر اُٹھا رکھّا ہے

عارضِ صُبح کو دیکھوں تو لگے
اُس نے غازہ سا اُڑا رکھّا ہے

اِس نئے عہد میں اب کیا آئیں
پہلے کب اپنا کہا رکھّا ہے

ہم سفر وہ ہے تو منزل معلوم
اُس نے دُنیا کو چلا رکھّا ہے

اُس کے آغوش میں آنے تک ہُوں
لہر پر ایک دِیا رکھّا ہے

گُلوں کو چُوم کر آئی صَبا سی لگتی تھی
تھی اِک نظر پہ معطّر ہوا سی لگتی تھی

میں زخم زخم تھا لیکن گلاب ہاتھوں میں
بڑی تھی چوٹ تو لیکن ذرا سی لگتی تھی

وہ تُرش گو لبِ جاں بخش بھی تھا کیا کہیئے
کہ تلخ بات بھی اُس کی دَوا سی لگتی تھی

ستم کو حُسنِ ستم کر گیا وہی ورَنہ
یہی تھی زندگی لیکن سزا سی لگتی تھی

مری تڑپ کو سمجھتا تھا اِک عبادت وہ
مُجھے بھی اُس کی محبت دُعا سی لگتی تھی

چلو وہ آنکھ میں پانی تو دے گیا ورنہ
یہ سانس اندھے کنُویں میں صدا سی لگتی تھی

رنگ بارئ فلک تھی کہ بدن تھا اُس کا
میری آنکھوں میں دھنک تھی کہ بدن تھا اُس کا

آئینہ خانہ تھا ہر عضو نگاہوں کے لئے
کسی ہیرے کی دمک تھی کہ بدن تھا اُس کا

اُس کے چہرے کی شفق دیکھ کے دیکھا نہ گیا
چڑھتے سُورج کی چمک تھی کہ بدن تھا اُس کا

پاس بیٹھا تو لگا آگ پکڑنے میں بھی
کسی شعلے کی لپک تھی کہ بدن تھا اُس کا

ٹوٹ کر گِرتا کوئی اور ثمردار شجر
وہ تو کہئے کہ لچک تھی کہ بدن تھا اُس کا

تُجھ کو معلوم ہے اے دستِ تہی کچھ تو بتا
میری باہوں میں مہک تھی کہ بدن تھا اُس کا

جب بات چھڑ گئی نگہِ ارجمند کی
ہر بات چھوڑ دیجئے جی کے گزند کی

دیکھو گے تم تو تم بھی اُسے مان جاؤ گے
وہ شخص جس نے درد کی دُنیا بلند کی

انگڑائی ہو سکی نہ کبھی اُس پہ خیمہ زن
کھنچ کر طناب ٹوٹ گئی بند بند کی

ٹھکرا کے مجھ کو تو مری بیچارگی تو دیکھ
مَیں دے رہا ہوں داد تری ناپسند کی

ہم تو سمجھے تھے کہ دریا میں اُتر جائیں گے
یہ نہ سوچا تھا کہ روئیں گے تو بھر جائیں گے

کر سکیں گے نہ زمانے میں وفا کی تعریف
تری خاطر تری خوبی سے مکر جائیں گے

ہم فقیروں کو بہت ہے یہی مہلت جو مِلے
اِک دُعا رکھ کے ترے در پہ گزر جائیں گے

گھر سے نکلے تھے کسی خواب کی خوشبو لیکر
یہ نہ معلوم تھا صحرا میں بکھر جائیں گے

برف کو برف ہی رہنے دو ہمیں آنچ نہ دو
اب اگر حال بھی پوچھو گے تو مر جائیں گے

یُوں نہیں خط وہ پُرانے ہی تبہ کر کے گیا
وہ تو فردا کے بھی صفحوں کو سِیہ کر کے گیا

کہیں پانی بھی تھا مُجھ دشت میں چھاؤں بھی تھی
وہ غزال آیا تو بے آب و گیہ کر کے گیا

اب کسی بزم نہ خِلوت میں اماں مِلتی ہے
نذرِ آتش وہ ہر اک جائے پنہ کر کے گیا

آج تک ڈھونڈتا پھرتا ہوں وہ نشتر دِل میں
مُجھ پہ ایسی بھی وہ کم کم سہی نِگہ کر کے گیا

غم تو یہ بھی ہے کہ تقدیر بھی روئی برسوں
ہائے وہ زُلفِ گرہ گیر بھی روئی برسوں

دِل کسی ساعتِ گریاں کا نوشتہ جس کی
ہُوئی تفسیر تو تفسیر بھی روئی برسوں

آبدیدہ بھی تھا مَیں نقش بہ دیوار بھی تھا
مجھُ کو دیکھو کہ یہ تصویر بھی روئی برسوں

اُس کو بھی کرنا پڑی دشت نوردی کیا کیا
پاؤں پڑ کر مرے زنجیر بھی روئی برسوں

ہم نفس کی ہم نشینی تھی بہ مستی ایک دن
عُمر کے سارے برس تھے اپنی ہستی ایک دن

آگ دِل کی دِل تلک تھی اُس نے جب دیکھا نہ تھا
راکھ جل کر ہو گئی بستی کی بستی ایک دن

ہم غریبوں پر کرم ہے گاہے گاہے اِسلئے
ڈھول ڈھپّا کر نہ دے یہ تنگدستی ایک دن

کِس نے سوچا تھا زمانہ ہو گا یُوں زیروزبر
بیٹھ جائے گی بُلندی پر بھی پستی ایک دن

دہر سے ڈرتے رہیں گے یُوں پسِ مُردن بھی ہم
ہم کو زندہ کر نہ لے مُردہ پرستی ایک دن

دِل نے لوٹائے تھے ہر دُشمنِ جاں کے غمزے
اُس کے ترکش میں ہیں کیا جانے کہاں کے غمزے

خاک ہو جاتی ہے اِک چشمِ زدن میں خواہش
پھُونک دیتے ہیں یوں اُس سروِ تپاں کے غمزے

وہ جو دیکھے تو کرے عشوہ گری صبحِ یقیں
وہ نہ دیکھے تو ڈھلیں شامِ گماں کے غمزے

شبنمی رات میں تاروں کے چراغاں کی طرح
مُجھ میں روشن ہیں مِرے ماہِ رواں کے غمزے

ذِکر اُس نرگسِ بیمار کی رمزوں کا ہُوا
خود نکلنے لگے معنی و بیاں کے غمزے

وہ کہ حسبِ وعدہ جو روز آ کے مِلتا تھا
اُس سے تو بچھڑنا بھی خوش مزاج رہتا تھا

مُسکراتے ہونٹوں پر جو شفق تھی پردہ تھی
وہ وِداعی شاموں کی آنچ میں پگھلتا تھا

اُن دِنوں دُپہرے بھی تھے گلوں کے سائے سے
اُن دِنوں کا سُورج ایک چہرے سے نِکلتا تھا

میرے ہر اُفق کو وہ دے گیا غروب ایسا
مَیں دِیئے جلا کر بھی کچھ نہ دیکھ سکتا تھا

مُجھ خزاں بلب پر ہی کھِل سکیں نہ اُمیّدیں
مُجھ پہ برگِ گُل کی وہ بارشیں بھی کرتا تھا

اب چلا گیا ہے وہ ساتھ کِس مُسافر کے
حادثہ تو روز اُس کے پاس سے گزرتا تھا

دِلوں کی بات نہ کرنا کہ ہیں خمیر نئے
مشینی لوگ ہیں یہ لوگ بے ضمیر نئے

وقار میں تھی کہاں خُرد سال خوُد غرضی
صغیر کِتنے ہُوئے آج کے کبیر نئے

یہ پانچ سال تک اب مانگنے نہ نکلیں گے
بہت امیر ہیں اِس دَور کے فقیر نئے

کچُھ اور دیر ابھی تہذیب پھڑپھڑائے گی
ہیں بے لحاظ زمانے میں ہم اسیر نئے

اِن ادھ پڑھوں نے تو سارے اصول توڑ دِیئے
بنے ہیں شہر میں کچُھ لوگ جو امیر نئے

وہ دیکھنے میں تو سادہ نِگاہ لگتا ہے
کہاں سے روز چلاتا ہے اِتنے تیر نئے

کب تک اُٹھائیں فیض بھی ایسے سخی سے ہم

تنگ آ چکے ہیں آنکھ کی دریا دِلی سے ہم

اب کہانی بھی کہاں ہے وہ نظر تھی جب تھی
زندگی اپنی حقیقت تھی مگر تھی جب تھی

تیرا الہام اگر ہو تو اِسے ہوش آئے
دلِ برباد کو اپنی بھی خبر تھی جب تھی

ہم سے ہوتی نہیں آوارگی بھی بے مقصد
دشت پیمائی تری راہ گذر تھی جب تھی

ہر نفس ٹوٹ گیا پاؤں میں کانٹے کی طرح
یہی زنجیر مری زادِ سفر تھی جب تھی

چاک داماں یہ مرا رسم تو ہیں کچھ ہی دِن سے
تھی محبّت بھی مگر خاک بسر تھی جب تھی

لے گیا کاٹ کے اب وقت تری یاد کو بھی
بس اِسی رزق پہ صحرا میں گذر تھی جب تھی

کی حکومت بھی، یہ محکوم بھی کہلائے وہی
ظُلم یُوں بھی ہے کہ مظلوم بھی کہلائے وہی

جن کے ہاتھوں رہے بے رزق بھی بے آب بھی ہم
کیا سیاست ہے کہ محروم بھی کہلائے وہی

ہم سے معصوم نہتّوں کو تہِ تیغ کیا
اور پھر دہر میں معصُوم بھی کہلائے وہی

سرِ محفل جو جلاتے ہیں وطن کی عزّت
ملک کے لازم و ملزُوم بھی کہلائے وہی

ایک تو چُپ رہے ہر ظُلم و تشدّد پہ ادیبؔ
اور پھر صاحبِ مفہوم بھی کہلائے وہی

غم گساروں میں کہیں بیٹھ کے روئیں دونوں
آ کہ یاروں میں کہیں بیٹھ کے روئیں دونوں

دل بجھے ہیں تو بہاروں میں یہی جشن سہی
آ بہاروں میں کہیں بیٹھ کے روئیں دونوں

اپنی ناکام امیدوں کو چراغاں کرلیں
اِن مزاروں میں کہیں بیٹھ کے روئیں دونوں

آج موسم کی اُداسی کا تقاضہ ہے یہی
اِن نظاروں میں کہیں بیٹھ کے روئیں دونوں

چلو تنہائی میں رونے کی روایت توڑیں
رہ گذاروں میں کہیں بیٹھ کے روئیں دونوں

جو نہ گلشن نہ گلابوں سے نکل کر آئے
وہ تو خوشبو ہے جو خوابوں سے نکل کر آئے

اِتنی رنگیں تو نہیں ہوتی قبا، کیا ہوگا
گر مرا چاند سحابوں سے نکل کر آئے

غم کے تارے بھی بجھے جاتے ہیں اُس سے کہدو
صورتِ صبح حجابوں سے نکل کر آئے

زندگی اب تو ترا شہرِ حقائق یہ کہے
کوئی صحرا نہ سرابوں سے نکل کر آئے

کبھی وہ بھی تو ثنا خواں ہو کہ جِسکی خاطر
اِتنے خونریز عذابوں سے نکل کر آئے

جب کوئی لفظ ترے پیار کے قابل نہ مِلا
کوئی معنی نہ کتابوں سے نکل کر آئے

کِس پہ قُربان، کِسے یاد، ہُوئے تھے ہم بھی
یاد اتنا ہے کہ بَرباد ہُوئے تھے ہم بھی

اُن دِنوں بھی تھے کہاں معنی و الفاظ بہم
لب خاموش سے اِرشاد ہُوئے تھے ہم بھی

اب تو دیوار پہ لِکھّے ہیں کئی نام نئے
اس حسیں شہر کی رُوداد ہوئے تھے ہم بھی

تھا وہاں پیڑ نہ پانی نہ پرندہ کوئی
کِس جلے دشت میں آباد ہُوئے تھے ہم بھی

ہم نہیں ایسے کہ اب جشن منائیں جھوٹے
اوّل اوّل تو بہت شاد ہُوئے تھے ہم بھی

لے گئے سارے پَر و بال اُڑا کر کرگس
یاد آتا ہے کہ آزاد ہُوئے تھے ہم بھی

بے مہر کہوں کیسے، ہے موم جفاؤں میں
پتّھر تو نہیں رکھ دوں جس کو میں خداؤں میں

اس برف نگاہی سے ٹکرا کے بہے آنسو
اٹکا تھا سمندر یہ اب تک تو گھٹاؤں میں

سوچا تھا کہ رو رو کر دھو دوں گا عتاب اُسکا
اب اُس نے کیا لازم ہنسنا بھی سزاؤں میں

دُنیا نے اے جانِ جاں کب کُفر نہیں تولا
تُم تو نہ کرو شامل اُلفت کو خطاؤں میں

اظہارِ محبّت میں ہاتھوں سے گیا دِل بھی
کیوں ہم نے پرندے کو چھوڑا تھا فضاؤں میں

پھر ہم نے مُقدّر کو روکا نہ بگڑنے سے
جب ہاتھ نرا دیکھا دُشمن کی دُعاؤں میں

رنگ بکھر دے مئے گُلفام پہ بوسہ رکھ دے

ساقیا! آج تو ھر جام پہ بوسہ رکھ دے

وہ اُداسی کو شفق زار بنا جاتا ہے

وہ ہے سورج جو لبِ شام پہ بوسہ رکھ دے

اُس کا الزام ہے ھر بار اُٹھانے والا

وہ تو ہر بار ہی اِلزام پہ بوسہ رکھ دے

اُس کی آمد ہے وہ پھولوں کا سماں جب ہر سُو

فصلِ گُل گردشِ ایّام پہ بوسہ رکھ دے

کُچھ تو رنگین ہوں یہ زخمِ تمنّا کے مرے

اے محبّت دلِ ناکام پہ بوسہ رکھ دے

یُوں دمکتا رہے چہرہ کہ چراغاں جیسے

تُو نے جانا ہے در و بام پہ بوسہ رکھ دے

احساسِ بے زباں کی لطافت اِسی میں تھی
میں نے کہا نہ کچھ کہ محبّت اِسی میں تھی

یہ شہر جس میں نام کمانا مُحال تھا
ہم گفتگوئے شہر تھے شہرت اِسی میں تھی

ویسے تو دِل کے ٹوٹنے کا کچھ نہیں ملال
لیکن ترے جمال کی صورت اِسی میں تھی

اچھّا ہُوا کہ دیکھنے آیا نہ وہ ہمیں
چہرے پہ پت جھڑوں کی عزّت اسی میں تھی

یارانِ کم نگاہ اِسے دیکھتے بھی کیا
یہ سادگی کہ ساری قیامت اِسی میں تھی

وہ یوں بھی مِرے سانس سے تعلیق کرے ہے
آئے ہے مگر آنے میں تعویق کرے ہے

اِک میں جو اُسے جمع کروں غمزہ بہ غمزہ
اِک وہ جو مجھے مجھ سے بھی تفریق کرے ہے

اُڑنے سے جما عشق کا یہ رنگ تو سمجھا
یہ خاک پرَ و بال بھی تخلیق کرے ہے

انصاف کی اُمّید نہ رکھیو کہ یہ دُنیا
ناکردہ گُناہوں کی بھی تصدیق کرے ہے

اب اُس کی نگاہوں میں جچا ہُوں تو ہُوا یہ
بے ذوق زمانہ مِری تحقیق کرے ہے

مشکل میں رہا وہ بھی کہ تدبیر نہ تھا میں
میں خواب تو تھا اُس کا پہ تعبیر نہ تھا میں

یوں بھی ہُوا اُس نے مجھے سجدوں سے نوازا
بدبختی سے جس شخص کی تقدیر نہ تھا میں

وہ چھوڑ گیا راہ میں یہ اُس کی رضا تھی
ویسے بھی کسی پاؤں میں زنجیر نہ تھا میں

اِس ذوقِ سُخن نے کیا رُسوائے زمانہ
پہلے تو ترے راز کی تشہیر نہ تھا میں

کرتا بھی تو کیسے مری پہچان زمانہ
دُکھ ایسا تھا خُود اپنی بھی تصویر نہ تھا میں

اب اِس مقام پہ لائی ہے بے وفا کی تلاش
بہت دِنوں سے ہے اِک آہِ نارسا کی تلاش

بدن پہ زخم لگا کر گئی جو فصلِ بہار
سمجھ لے مِل گئی تجھ کو تھی جس قبا کی تلاش

ہُوں جس کے لمس سے میں شاخ شاخ پر افشاں
کہاں گئی وہ ، مجھے ہے اُسی ہوا کی تلاش

کبھی تھی میرے تعاقب میں زندگی میری
مگر ہے آج مجھے اُس کے نقشِ پا کی تلاش

یہ جِن کے مُونہہ لگا ہے اب آدمی کا لہو
یہی وہ لوگ تھے کرتے تھے جو خُدا کی تلاش

بے چہرہ حرف ہے پھر بھی دِکھائی دے
وہ جو کہے ہے آنکھ سے مجھ کو سُنائی دے

اُس کے ستم کا رنگ زمانے سے ہے جُدا
وہ زخم دے کہ ہاتھ میں دستِ حنائی دے

اِس لُوٹ مار میں مری آنکھیں تو چھوڑ دو
اِتنا تو ہو کہ مجھ کو اندھیرا دِکھائی دے

کم کبھی راہ کے آزار تو ہوتے ہوں گے
آبلہ پائی! کہیں خار تو ہوتے ہوں گے

مُجھ سے یہ سوچ کے وہ میرا پتہ پوچھے تھا
تنگ دستوں کے بھی گھر بار تو ہوتے ہوں گے

اُس سے بچھڑا ایں اندھیروں کا مکیں ہوں ورنہ
کوئی گھر ہو، در و دیوار تو ہوتے ہوں گے

وہ جہاں بھی ہو اُسے دیکھ کے اُس شہر کے لوگ
کُو بکُو نقش بہ دیوار تو ہوتے ہوں گے

مرگ جو اپنی طرح کوئی وہاں ہو کہ نہ ہو
لوگ اُسے دیکھ کے بیمار تو ہوتے ہوں گے

بے گنہ بھی تھا، نہتّہ بھی تھا میں اے قاتل!
قتل کرنے کے بھی معیار تو ہوتے ہوں گے

ہجر سے جشن کی تقلید نہ باندھی ہم نے
پھر کسی چاند سے بھی عید نہ باندھی ہم نے

آنکھ نے جانے دیا لمحہ مُرادوں والا
ہے گِلہ خود سے، تری دید نہ باندھی ہم نے

دھجّیاں اُس نے مراسم کی جو خود ہی کر دیں
دامنِ چاک سے اُمید نہ باندھی ہم نے

اُس پہ غنچوں کے چٹکنے کا نہ مفہوم کھُلا
ہیں خطاکار کہ تمہید نہ باندھی ہم نے

ظُلم حد سے جو بڑھا ہم نے سَلاسِل توڑے
ورنہ کِس ضبط سے تاکید نہ باندھی ہم نے

دردبن کر بھی دلِ وجاں میں نہیں رہ پاتا
وہ سنورتا ہے تو امکاں میں نہیں رہ پاتا

فصلِ گل جھیل کے یوں جسم دریدہ تو نہ تھا
چاک بھی اب تو گریباں میں نہیں رہ پاتا

حمد کیجئے بھی تو کیا اُس کی کہ ہے برق صفت
دو گھڑی دیدۂ حیراں میں نہیں رہ پاتا

کچھ تو غمزے بھی ہیں اُس دشمنِ دیں کے کافر
کچھ یہ دل بھی ہے کہ ایماں میں نہیں رہ پاتا

روزی روٹی کے سوالوں میں گھرا رہتا ہوں
دل میں جو شخص ہے ارماں میں نہیں رہ پاتا

نہ انحصار محافظ پہ پھر مزید رہا
اِس احتمال کا مَرنا بھی کچھ مفید رہا

تھی قتل کی جو گواہی سو وہ بھی قتل ہُوئی
جو اپنا خُون تھا وہ بھی نہ چشم دید رہا

کُھلے ہیں روز نئے کربلا تو کیا حیرت
ہمیں نہ یاد اگر اب کے روزِ عید رَہا

کُھلا یہ اب کہ ہیمبر تو اُس کے تھے ہتھیار
زمانہ نادر و چنگیز کا مُرید رَہا

بُجھادو آندھیاں نفرت کی ورنہ دیکھوگے
نہ شوقِ دید رہا ہے نہ ذوقِ دید رَہا

بچو اِس آگ سے کچھ تو کہ کوئی کہہ تو سکے
یہاں قدیم رہا ہے نہ کُچھ جَدید رہا

گفتگو بھی کرتے ہو گفتگو کی خاطر اب

ہاتھ بھی ملاتے ہو فاصلہ بھی رکھتے ہو

کس قدر ہے مصنوعی زخم خوردہ معصومی

قتلِ عام کرتے ہو اور گِلہ بھی رکھتے ہو

شہروں میں ناچتا ہُوا جنگل ہے اور مَیں
صدیوں کے بعد بھی وہی قاتل ہے اور مَیں

پاؤں کی گرد ہو چکیں کِتنی مسافتیں
اب بھی مگر وہ دوریِ منزل ہے اور مَیں

سمجھوں اب اور کیا تجھے کافر ادا نظام
برسوں سے ایک وعدۂ باطل ہے اور مَیں

پوچھو پسند تو ہے وہی چشمِ نیم باز
ویسے ہر ایک گام پہ مقتل ہے اور مَیں

مجبور کو مظلوم کو لڑنے بھی نہ دیں لوگ

قاتل کا، ہمیں ہاتھ پکڑنے بھی نہ دیں لوگ

پہلے کے تشدّد میں اُجڑنا تھا میسّر

اب ظلم ہے یہ بھی کہ اُجڑنے بھی نہ دیں لوگ

دیکھنے والوں کو بھی دِید کے قابل کر دے

ایک ہیرہ ہے جو اوروں کو بھی جھلمل کر دے

اُس کی آمد ہے سویرے کے اُجالے کی طرح

ماہ و انجم کی جو محفل کو معطّل کر دے

وہ تو اِک خواب ہے اور خواب بھی ریشم ریشم

نیند آجائے تو وہ نیند کو مخمل کر دے

اُس سے مِل کر ہُوئی اب خاطرِ نازک ایسی

بُوئے گُل آئے تو احساس کو بوجھل کر دے

وہ تو اِک برق ہے اور برق بھی ساون جیسی

آن کی آن میں جو پھونک کے جل تھل کر دے

وہ تو ہم ہیں کہ سلامت ہیں ابھی تک بھی حواس

اچھے اچھّوں کو بھی وہ رُوپ تو پاگل کر دے

اُسے بُھلانے کی کوشش میں شہر چھوڑ آئے
جو آئے عقل کی سازش میں شہر چھوڑ آئے

یہ سوچ کر کہ کہیں وہ بھی زیرِ آب نہ ہو
ہم ابر، موسمِ بارش میں شہر چھوڑ آئے

بغل میں آگ لئے شہر سے گزرنا تھا
جو خود جلے جلے آتش میں شہر چھوڑ آئے

حویلیوں کی کئی بند کھڑکیاں چٹخیں
چلے جو شہر سے لرزش میں شہر چھوڑ آئے

پھر اُس کے بعد فقیروں نے یوں ثواب کیا
کہ شہر والوں کو بخشش میں شہر چھوڑ آئے

بچھڑتے وقت تو ہر اک سے ہنس کے ملنا تھا
یہ کیا کیا ہے ہم رنجش میں شہر چھوڑ آئے

خاکِ سکوت سے نکل کے رنگ و بُو میں آ
ہم بھی سُنیں اے غنچہ دہن گفتگو میں آ

کیسے بتاؤں یُوں میں تجھے دِل کی بے بسی
یہ آرزو بھنور ہے، کبھی آرزو میں آ

میں نے تو پانیوں سے یہ پتھر ہٹا دیا
تُو بھی بدن کو چھوڑ کے میرے لہو میں آ

منزل سہی یہ تجھ کو بھی چلنا پڑیگا اب
میں تھک گیا ہوں اب تُو مری جستجو میں آ

ساقی گری ہماری بھی کچھ تو خیالِ یار
ڈھلنے لگی ہے شام تو ڈھل کر سُبو میں آ

تھی قہر سادگی بھی سنورنے سے پیشتر
شہ رگ پہ نیشتر تھا اُترنے سے پیشتر

پھرتا ہوں در بدر میں مگر مثلِ بوئے گل
میرا بھی تھا مقام بکھرنے سے پیشتر

بے اشک کیا ہُوا کہ میں بے عکس ہو گیا
آئینہ تھا یہ پانی اُترنے سے پیشتر

ہجرت سے پہلے ہجر کے تھے وسوسے مجھے
ہر لمحہ حادثہ تھا گزرنے سے پیشتر

اِس نزعِ انتظار کو اِک عُمر ہو چلی
کیسی ہمیشگی ہے یہ مرنے سے پیشتر

تیری نظر کی لاکھ نگہبانیوں میں تھا
میں تو نگاہِ اوّلیں سے فانیوں میں تھا

حیرت ہے کیا جو ٹوٹ گیا مثلِ آئینہ
دِل کو تھا یہ گماں کہ ترے ثانیوں میں تھا

اب تو چلو یہ رات ہے لوٹی پہاڑ سی
دن بھی نہیں ہے یاد جو آسانیوں میں تھا

ٹھکرا رہا ہے آج وہ ہر دعوتِ نفس
کل تک جو لب بہ لب تری مہمانیوں میں تھا

مجھ میں نہیں ہے کچھ جو تری حیرتیں نہیں
جو تھا تری نگاہ کی حیرانیوں میں تھا

کچھ کہہ سکا نہ ڈوبتی آواز میں اُسے
آنکھوں تلک میں چڑھتے ہوئے پانیوں میں تھا

اب کیا کہیں کہ کون سی راہوں میں کٹ گئے
مقتل سے بچ گئے تو نگاہوں میں کٹ گئے

خنجر لگا ہمیں تو وہ آغوش انگ انگ
ہم وہ پنہ گزیں جو پناہوں میں کٹ گئے

اُن کو گلہ رہا تری نازک گرفت سے
وہ دِن جو تیری مرمریں باہوں میں کٹ گئے

اُس گردشِ نگاہ کا مرکز ہی اور تھا
ہم تو تھے بس وہ موڑ جو راہوں میں کٹ گئے

آیا نہیں ہے یاد وہ بھولے سے جن دِنوں
لگتا ہے دِن وہ سارے گناہوں میں کٹ گئے

بہتی ندی تھی اور ہمیں عکس کی تلاش
ہم لہر لہر اپنی نگاہوں میں کٹ گئے

کھُلے ہیں سینکڑوں روزن تو پھر کہاں دیوار
مری نگاہ میں شب ہے نہ آسماں دیوار

تھے خوش مزاج تو ملنے کو جی مچلتا تھا
دلِ اُداس بنا اپنے درمیاں دیوار

ہُوا احاطۂ آغوشِ بے مکیں جب سے
ہیں اِک محل جو ہُوا گرتی بے زباں دیوار

ملے نہ چھاؤں تو سر پھوڑنا تو ممکن ہو
کہیں ملے تو سہی اپنی مہرباں دیوار

چلا گیا ہمیں کر کے وہ گھر میں ہی بے گھر
کہ گھر تو ہو نہیں سکتے فقط مکاں، دیوار

ہمیں بھی صُورتِ سایہ پنپتے پاؤ گے
کھڑی کرو گے اے لوگو جہاں جہاں دیوار

ہمارے عہد میں اِنساں کا مرنا
کبھی مِلنے کا موقعہ ہو گیا ہے

جسے ہے آج کل تشویش تیری
ہمارے حال پر بھی رو گیا ہے

پڑیں گے کاٹنے پھوڑے تو خود ہی
یہ غم چاہے کوئی بھی بو گیا ہے

بہت شرمندہ ہے اب شہر میں وہ
ترے ہوتے اکیلا ہو گیا ہے

یہ تن اب شوق سے مجھ بِن پہنیو
یہ گریہ مَیل ساری دھو گیا ہے

یہ دِل رو رو محبّت مانگتا تھا
یہ بچّہ دُودھ بِن ہی سو گیا ہے

لہریں تھیں جو ہوائیں وہ دریا اُسی کا تھا
لَوٹ آئے تم جہاں سے وہ صحرا اُسی کا تھا

اک فرض تھا کہ کاٹ دی شب کی ہر اک طناب
سُورج یہ جانتا تھا یہ خیمہ اُسی کا تھا

پتھرا گئی تو آنکھ بصیرت یہ دے گئی
بہہ کر چلا گیا جو وہ سپنا اُسی کا تھا

ایسا نہیں کہ تھے نہ ہمیں جان و دل عزیز
اُس کا جو ہو شہید وہ ہوتا اُسی کا تھا

اُس سے گِلہ کیا بھی تو اِک شکریئے کے ساتھ
جس دھوپ سے پریشاں تھے سایہ اُسی کا تھا

کھنچے گئے نہ زندگی کے ہم سے خال و خد
ہر رنگ میں کمی کو تقاضا اُسی کا تھا

تجھ کو دیکھا تو مری آنکھ نے دیکھا مُجھ میں
جھلملاتا ہے کوئی پہلے ہی تجھ سا مُجھ میں

ایک گرتے ہُوئے ایواں کا بھروسہ کیا ہے
بس اِسی خوف سے وہ شخص نہ ٹھہرا مُجھ میں

اِتنا گہرا تھا کہ گہرائی مُجھے لے ڈوبی
سب کناروں پہ رہے کوئی نہ اُترا مُجھ میں

بیٹھ جاتا ہے تھکا درد یہاں آکے کبھی
یاد کیا ہے ؟ تری دیوار کا سایا مُجھ میں

گئے موسم کی کھُلی دھوپ نہ یادوں پہ پڑے
برف پگھلے گی تو چڑھ جائیں گے دریا مُجھ میں

گھر سے نِکلے آج پینے زندگی کی شام ہم
آ گھُما لائیں تجھے بھی گردشِ ایّام ہم

دِھیان سے تیرے لبالب سب سے ٹکراتے پھِرے
تیری گلیوں میں چلے لیکن برنگِ جام ہم

ہر نفس شہ رگ میں کانٹے کی طرح لوٹا رہا
زندگی پیچھے تھی اور آگے شکستہ گام ہم

ہم کہ تن آساں ہیں، ہم سے کیا، عدو سے پوچھیا
کتنی مشکل سے ہوئے ہیں دہر میں ناکام ہم

بس اِسی امّید پر، ہوگا کبھی تو بھی طلوع
دیکھتے ہیں رات دن کِتنے چراغِ بام ہم

نہ تلافیاں ہی مانگیں نہ وفا نہ پیار مانگیں
چلو آج اُس سے کھویا ہُوا اعتبار مانگیں

ترے شہر میں ہمیشہ یہی قلّتیں سہی ہیں
کبھی اِس سے طوق مانگیں کبھی اُس سے دار مانگیں

ترے عہد میں نہ جینا ترے عہد میں نہ مرنا
ہمیں اختیار ہو تو کوئی اختیار مانگیں

تری بے رُخی کے صدقے تری بے رخی نہیں ہے
یہی تو ہے وہ ادا جو ترے جاں نثار مانگیں

کہیں یُوں نہ ہو کہ کل ہم غمِ یار سے بھی جائیں
چلو آرہی رُتوں سے وہی انتظار مانگیں

آفت نہ بنو، ظلم کے شہکار تو تُم ہو ہی
رُک رُک کے چلو کچھ تو کہ تلوار تو تُم ہو ہی

اُس خاطرِ نازک پہ بھی اے دِل تُو گراں گزُرا
خود اپنے لئے زیست کا آزار تو تُم ہو ہی

دُنیا کو بُرا کہہ کے یہ اِک اور خطا کی ہے
پھر جرُمِ محبت کے گنُہگار تو تُم ہو ہی

سچ بات کے کہنے میں تو سو طرح کے خطرے ہیں
تم گول کرو بات کو فنکار تو تُم ہو ہی

گھبرائیں بھی ہم تُم سے پہ ٹکرا تو نہیں سکتے
سایہ بھی تمہارا ہے، یہ دیوار تو تُم ہو ہی

چارہ سازی کا طلب گار لگے ہے وہ بھی
اِک مسیحا ہے سو بیمار لگے ہے وہ بھی

جس کی خاطر لی زمانے کی عَداوت ہم نے
اب زمانے کا طرفدار لگے ہے وہ بھی

اب رگِ جاں کو بچاؤں تو بچاؤں کیسے
سانس چلتی ہے تو تلوار لگے ہے وہ بھی

کس طرح منزلیں طے ہونگی بدن کی اے دِل
اُس سے مِلتا ہوں تو دیوار لگے ہے وہ بھی

بے مُغیلاں سہی تپتے ہوئے صحرا کا سفر
پاؤں رکھتا ہوں مگر خار لگے ہے وہ بھی

بے آب موسموں کا سامان کر کے رو دیا
یہ دِل کہ آنکھ کو بھی ویران کر کے رو دیا

اُس خیر خواہ کو بھی خود ہی تسلیاں دوں
کس کس دُعا کا وہ بھی نقصان کر کے رو دیا

ساون کی زد میں آئے پھر قہقہے بستی
تیرا خیال ہم کو حیران کر کے رو دیا

اُس کو پتہ نہیں تھا لائے تھے پل کی مہلت
وہ میزبان ہم کو مہمان کر کے رو دیا

ڈھونڈا فرار اُس نے جب اِک رفیقِ نو میں
وہ اپنی مشکلوں کو آسان کر کے رو دیا

دُور یُوں تو ہو گئے ہٹ کر ترے رستے سے ہم
پھر جیئے بندھ کر اِسی ٹوٹے ہوئے رِشتے سے ہم

جَان نکلتی ساعتوں سے دِل لگی کرتے رہے
ہنستے ہنستے بِچھڑے تھے اِک پھول سے چہرے سے ہم

بھیڑ میں ٹِچکا کئے یُوں تو کئی غنچہ دہن
جَان جاتے تھے اُسے اُس کے لب و لہجے سے ہم

بات دِل کی دہر سے ہم کہہ کے ہلکے پڑ گئے
آشنا اچھے بھلے تھے اَن کہے جذبے سے ہم

بخشِشیں تو کیا، کھُلا ہم پر نہ کُچھ بابِ حیات
اِلتجا کرتے رہے اِک بند دروازے سے ہم

باتوں سے سب کی یُوں تو پرسش برس رہی ہے
آنکھوں سے دوستوں کی سازش برس رہی ہے

دُنیا تھی منتظر بس تیری جُدائیوں کی
اب ہم پہ ہر کسی کی دانش برس رہی ہے

میری ہنسی نے جیسے اِک قتل کر دیا ہو
سارے نگر کی مجھ پر رنجش برس رہی ہے

ٹھنڈی ہوائیں لے کر ساون بھی آ گیا ہے
تیرے بغیر لیکن آتش برس رہی ہے

بنجر زمیں کبھی تو پُوچھے یہ بادلوں سے
ہریالیوں پہ ہی کیوں بارش برس رہی ہے

آیا نہ پوچھنے جب تھے زخم تازہ تازہ
جب فصل پک چُکی تو بارِش برس رہی ہے

وہ تو حشر تھا مگر اُس کی اب وہ شباہتیں بھی چلی گئیں
جو رہیں تو شہر میں کیا رہیں کہ قیامتیں بھی چلی گئیں

ترے دَم سے تھیں سبھی رونقیں وہ حبیب تھے کہ رقیب تھے
وہ قرابتیں تو گئی ہی تھیں وہ رقابتیں بھی چلی گئیں

ترا قُرب گرچہ تھا جاں گُسل وہی قرب تھا مری زندگی
ترے بعد مرگ و حیات کی وہ رفاقتیں بھی چلی گئیں

مری آرزو تھی کہ جاں بکف مری جستجو کہ نفس بہ پا
اب اے زندگی مجھے چھوڑ جا کہ یہ حالتیں بھی چلی گئیں

تُو نے دی جو درد کی دَولتیں وہ غزل غزل نہ سما سکیں
مرے ہاتھ سے ترے حُسن کی یہ وراثتیں بھی چلی گئیں

اُسے دیکھ دیکھ کے سوچنا اُسے سوچ سوچ کے دیکھنا
وہ عزیز کیا کہ عزیز تر کئی عادتیں بھی چلی گئیں

وہ شاخِ گل جو سدا غم گرفتہ رہتی تھی
اُسی سے مِل کے اُداسی شگفتہ رہتی تھی

پھرے ہے ڈھونڈتی اب آنکھ قلزموں میں اُسے
وہ شہر جس میں مِری عُمرِ رفتہ رہتی تھی

غموں نے جاگ کے کی عُمر کی نگہبانی
تھی پاسبان تو قسمت پہ خُفتہ رہتی تھی

تجوریوں میں امیروں کی سارا زر تھا رکھا
سبھی کی زندگی، سب سے نہفتہ رہتی تھی

کہاں تھی پہلے یہ رنگت اُداس ہونے کی
وہ گُل تھا دے گیا نکہت اُداس ہونے کی

وہ اوس کیسے کڑی دھوپ سے نبھائے گی
اُسے پڑے نہ ضرورت اُداس ہونے کی

گھروں میں قید سے بڑھ کر ستم کبھی دیکھے ہیں
گھروں میں تھی نہ اجازت اُداس ہونے کی

تعلّقاتِ مہذّب کہاں سے پیدا ہوں
یہ لوگ کھو چُکے طاقت اُداس ہونے کی

گہرے سمندروں میں تو خود کو ڈبو کے دیکھ
گر دیکھنا ہے میری چمک کو تو رو کے دیکھ

اُڑ ہی نہ جاؤں جاگتی آنکھوں کے راستے
نازک مزاج خواب ہوں میں مجھکو سو کے دیکھ

پہلے گلے کا ہار بنا یا بکھر گیا
اب ہو سکے تو سانس میں اپنے پرو کے دیکھ

بھٹکے ہوئے سے ملتا ہے بھٹکا ہوا کوئی
میری تلاش ہے تو مجھے راہ کھو کے دیکھ

آنکھ سے ٹپکا میں اُس کی، سب پہ ظاہر ہو گیا
بند کمرہ مرنے تک اُس کا مقدر ہو گیا

جیسے اُس کے ساتھ ہی جاتا رہا میرا وقار
اب تو یوں لگتا ہے میں کم سے بھی کم تر ہو گیا

ٹیس بھی اُٹھتی نہیں اب اشک بھی آتے نہیں
ریزہ ریزہ ہو کے میں بھی ایک پتّھر ہو گیا

دیدنی ہیں طُور کی مانند یہ آنکھیں مری
اُس نے کیا دیکھا کہ میں بھی ایک منظر ہو گیا

غمزدہ ہوں سرنگوں ہوں اِسکے معنی یہ نہیں
ھر کس و ناکس مرے قد کے برابر ہو گیا

سب نے منوا تو لیا اُس کے بدل جانے کا سچ
لیکن اُس کے بعد میں خود سے بھی مُنکر ہو گیا

دیکھتا تھا جو کبھی پھُول سمجھ کر مُجھ کو
بچ کے چلتا ہے وہ اب دھُول سمجھ کر مُجھ کو

وہ مُجھے بھُول بھی جاتا تو نہ ہوتا افسوسؔ
یاد رکھّا بھی تو اِک بھُول سمجھ کر مُجھ کو

پھر دُعاؤں کو بھی بخشی نہ سماعت اُس نے
ایک فریادیِ معمُول سمجھ کر مُجھ کو

میں حُسنِ مرگ مانگتا ہوں کیسے آئے موت
تجھ سی ہو کج ادا تو نہ پل بھی لگائے موت

میں جی رہا ہوں کب سے جیسے زندہ موت ہے
مجھ پر کسی حیات کا دھوکا نہ کھائے موت

اِس زندگی سے اِتنا ہراساں ہُوا ہوں میں
ڈرتا ہوں زندگی نہ ہو مَر کر بجائے موت

اب کس خُدا کا نام لوں بہ رسمِ آخری
جس پہ تھا ناز بن گیا آخر خُدائے موت

رکھنا پڑی ہر آرزو خود ہی صلیب پر
مَیں جی رہا ہوں خود کو ہی دے کر سزائے موت

حرفِ دُعا تھا پاس سو وہ بھی گنوا دیا
میں خالی ہاتھ رہ گیا کر کے دُعائے موت

بَس تھک گیا تو چھوڑ کر اُونچی اُڑان کو
بستی کے اِس شجر پہ ٹھکانہ بنا لیا
بیٹھا تھا پر سمیٹ کے شاخِ سکوت پر
بولا تو چھوکروں نے نشانہ بنا لیا

رنگ میں اُس کے ہی جب ڈھلنے لگے افکارِ دوست
پھر تو اِک اِک لفظ سے ہونے لگا دیدارِ دوست

اپنا یہ عالم کہ دِن عکسِ جبینِ دوست ہے
سُرخیِ شام و سحر ہے پرتوِ رُخسارِ دوست

یہ شبِ ہجراں گرہ ہے صبح تک بالشت بھر
چاہیئے دستِ جنُوں کو گیسوئے خم دارِ دوست

حُسن اُس کا تھا بذاتِ خود تلافی درد کی
دوستی اُس سے تھی گرچہ جو نہ تھا غمخوارِ دوست

تجھ کو اے مرنے کی حسرت پھر سے زندہ کر دیا
ہم مسیحا ہو گئے جب سے ہُوئے بیمارِ دوست

آخر آخر کھینچ لائی تیرہ غاروں میں ہمیں
اوّل اوّل زندگی تھی سایۂ دیوارِ دوست

رکھ کے جذبات کے پھولوں کو غزل میں لائے
لوگ پتّھر ہی مگر ردِّ عمل میں لائے

یہ تو دیکھو کہ ہے کس حال میں چھاتی پیٹی
کیسے ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کو عمل میں لائے

نہ گئی زیست کی آشفتہ مزاجی نہ گئی
بارہا وقت کو ہم ردّ و بدل میں لائے

کبھی سرسبز نہ پلکوں کی ڈھلانیں دیکھیں
ہم تو ندیاں بھی نشیبوں سے جبل میں لائے

دیکھ لی دین و دھرم کی بھی قیادت ہم نے
یہ تو جب لائے ہمیں جنگ و جدل میں لائے

دِل کی باتیں ہیں یہ، بوجھل نہ بناؤں اُس کو
مصلحت یہ ہے کہ کُچھ بھی نہ بتاؤں اُس کو

شہر میں جاکے کہوں کس سے بُرا حال اپنا
کوئی اپنا ہو تو احوال سُناؤں اُس کو

آ بسیں دِل میں کبھی روزی کی تمنائیں اب
اب کہاں جاؤں کہ دُنیا سے چھپاؤں اُس کو

ہر گلی کوچۂ قاتِل ہے دلِ ایذا طلب
کوئی مشکل ہو تو آسان بناؤں اُس کو

لمس مُمکن نہیں شعلے کا بِنا خاک ہوئے
پھُول ہو صرف تو سینے سے لگاؤں اُس کو

خونریزیِ بہار تھی کافی ، خزاں نہ دے
اَے وقتِ زرد ! اور بھی حیرانیاں نہ دے

اِک حُسن سامنے ہے یُوں اندھا نہ کر اے جِسم
جلنا ہی ہے تو آنکھ کو اِتنا دُھواں نہ دے

غنچہ دہن تو تھا ہی پہ لبؔ پر ہے مُہر بھی
ہم سے کرے وہ بات ہی بیشک زباں نہ دے

افسوس یہ کہ جس کے لئے دِین سے گئے
وہ شخص کہہ رہا ہے کہ مجھ کو اذاں نہ دے

مذہب ہے اب اے زندگی نفرت کی اِک کتاب
اب اہلِ دیں کے ہاتھ میں اپنی عناں نہ دے

ہم وہ رہے جو خندۂ گُل سے بھی زخم زخم
اس عہدِ نو سے کہہ دو ہمیں گالیاں نہ دے

ہنس کے مِلتا ہے بے مہر اُوپر سے

یہ ترا شہر ہے شہر اُوپر سے

آج تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں

کاٹ دی کس نے یہ نہر اُوپر سے

تجھ کو دیکھا ہے تو کیسے کہہ دیں

ہم پہ ہوتے ہیں یہ قہر اُوپر سے

اِک ترے غم میں ہیں ڈوبے ورنہ

جو بھی تھی گُذری تھی لہر اُوپر سے

بھوک بیمار تھی، اُس کو مذہب

کاش دیتا نہ یہ زہر اُوپر سے

دار پر کھینچ کے نکالا قد اور

ہم نے دیکھا ہے یہ دہر اُوپر سے

قاتل بچ کر صاف گیا
جانے کہاں اِنصاف گیا

مُڑ کر دیکھ اے تیز روی
اِک دَورِ اشراف گیا

کس کو ڈھونڈتے پھرتے ہو
وہ عہدِ اوصاف گیا

مجھے وقت کی پڑی تھی مرے پاس وقت کم تھا
مری آخری گھڑی تھی مرے پاس وقت کم تھا

میں نظر نظر میں تجھ سے جو بھی کہہ گیا بہت ہے
وہیں خلق بھی کھڑی تھی مرے پاس وقت کم تھا

میں حدیثِ نامکمل، مرے حرف بھی شکستہ
مری داستاں بڑی تھی مرے پاس وقت کم تھا

جبؔ ایک گُل عذار کی صُحبت میں آ گیا
عارض کا رنگ میری طبیعت میں آ گیا

اپنی رضا سے جس نے مراسم بڑھائے تھے
عرضِ طلب پہ وہ بھی نزاکت میں آ گیا

جی کے ضرر کو کون اُٹھاتا ہے آجکل
اس دِل کو داد دے کہ محبّت میں آ گیا

پھرتا ہُوں دہر میں لئے یہ دوستی کا ہاتھ
لگتا ہے مَیں بھی کوئے ملامت میں آ گیا

بے دِل سے ایک کرکے وفا یُوں لگا مجھے
یہ ہاتھ اِک مشین کی خدمت میں آ گیا

کٹ گئے ہم تو حبیبوں سے اِجازت لے کر
ہم سے مِلتا ہے رقیبوں سے اجازت لے کر

نہیں چارہ تو ہے تہذیب اِسی میں اے جاں
آج مر جائیں طبیبوں سے اِجازت لے کر

ہم تو مرتے رہے شمشاد قدوں پر اکثر
کیا جئیں آج صلیبوں سے اِجازت لے کر

تم نے پُوچھا تو عِنایت ہے تمہاری ورنہ
کون جاتا ہے غریبوں سے اِجازت لے کر

زندگی کیوں ہے تو اُب مِل کے پشیماں ہم سے
تم کو آنا تھا نصیبوں سے اِجازت لے کر

بادبانوں سے کناروں سے گزرتا تنہا
چل پڑا ہوں میں سمندر میں اُترتا تنہا

تن تنہا کیا گنجانِ شبِ غم کا سفر
کوئی قزّاق بھی ہوتا وہ بھی ڈرتا تنہا

کاش ہوتی نہ مری سوچ زمانے سے جُدا
اس بھری بزم میں محسوس نہ کرتا تنہا

وہی جاں بخش ہے جو شخص کہ جاں سوز بھی ہے
رہ گیا ہوں میں تضادوں میں بکھرتا تنہا

مجھ کو اپنوں سے تحفّظ پہ گماں ہوتا اگر
ہاتھ پاؤں میں بھی کچھ مارتا مرتا تنہا

سُن کے تہہ خانوں کے احکام اُتر جاتی ہے
دُھوپ سی آ کے سرِ بام اُتر جاتی ہے

غم کے جھرنے تو بہت ہیں، مری پلکوں سے مگر
ہر ندی ہے کہ ترے نام اُتر جاتی ہے

وہ گیا جب سے ہے بس ایک ہی موسم دل میں
صبح ہوتے ہی سیہ شام اُتر جاتی ہے

کبھی ہنستا ہُوں تو لگتا ہے بدن میں میرے
تیغ سی کوششِ ناکام اُتر جاتی ہے

زِندگی وہ کہ اِسے کوئی پیئے یا نہ پیئے
دُرد سی بن کے تہہِ جام اُتر جاتی ہے

کس دار پر ہے زندگی اپنی چڑھی ہوئی
یہ سانس ہے کہ طوق میں گردن کسی ہوئی

ہر گھر ہے ہر گلی ہے مرے ذکر کا غبار
ہے تیرا شہر یا مری مٹّی اُڑی ہوئی

پہلے پہل جو جاگتی آنکھوں کا خواب تھا
وہ شخص آجکل ہے مری نیند اُڑی ہوئی

سمجھے ہو مجھ کو دُکھ کا شناور تو سچ کہوں
پانی پہ لاش ہے یہ مری تیرتی ہوئی

یہ کن سمندروں نے پکارا ہے اب مجھے
آواز آرہی ہے مگر ڈوبتی ہوئی

مجھ بے نوا کی کچھ تو کہو بے گناہیو!
رکھ دو بجائے حرف زباں ہی کٹی ہوئی

پوچھوگے تو کھُل جائے گی زخموں کی زباں اور
پُرسشش تو گذرتی ہے غمِ دل پہ گراں اور

منظور جلانا ہے تو اِک بار جلا دو
یُوں دِل کے سُلگنے سے تو اُٹھتا ہے دُھواں اور

خاموشی نے رُسوائی کے گُل اور کھِلائے
دَفنایا محبّت کو تو اُبھرے ہیں نِشاں اور

اُس جیسا زمانے میں کوئی ایک تو ہوتا
اُس دَر سے اُٹھیں، اُٹھ کے مگر جائیں کہاں اور

چومے گا ترے پاؤں کو خوُد مرکزِ اُمّید
ہاں رقص میں آ، رقص میں آ عُمرِ رَواں اور

تا عُمر سُنا کیجئے اب نغمۂ خاموش
کہتے نہ تھے نازک ہے نہ چھیڑو رگِ جاں اور

خوش باش بادبان جو ساحل پہ جا لگے
اپنا بھنور تھا ہم اُسی منزل پہ جا لگے

ہم بے گُناہ چل ہی پڑے سُوئے دار جب
اِلزام بن کے تختۂ مقتل پہ جا لگے

نِکلا سفید خون ، بچانا تو اِک طرف
یُوں بھی نہیں کہ دامنِ قاتل پہ جا لگے

کچھ زخم تھے جو پھولوں میں رہ کر ہوئے گلاب
کچھ پھُول تھے جو زخم بنے دل پہ جا لگے

یہ تحمّل کی وِراثت تو نہیں بولے گی
ہم پہ جو گذُری محبّت تو نہیں بولے گی

صِرف ووٹوں پہ نظر رکھنا سیاست ہو جہاں
سچ وہاں کیا ہے سیاست تو نہیں بولے گی

اِن جریدوں میں خریدے ہُوئے مضموں پڑھ لو
واقعہ کیا ہے صحافت تو نہیں بولے گی

میرے گھر میں جو گذُرتی ہے پڑوسی سے سُنوں
اپنے برعکس حکومت تو نہیں بولے گی

بے اصولی ہو جہاں حزبِ مُخالف کا اصول
کوئی نعرہ ہو، صداقت تو نہیں بولے گی

ساری مخلوق ہے اب ظلم سے بھی آسُودہ
ایسی فرسودہ ثقافت تو نہیں بولے گی

جب تشدّد پہ ہوں چُپ خود ہی خُدا کے بندے
ظلم بولے گا مشیّتُ تو نہیں بولے گی

ایسے حالاتُ میں ہم خاک غزل خواں ہونگے
کچُھ کہیں گے بھی، طبیعت تو نہیں بولے گی

جب ہوئی قتل تو فریاد سے یلغار ہوئی
وہ سمجھتے تھے شرافت تو نہیں بولے گی

اُسے دیکھو، اُسے سمجھو، اُسے سوچو لوگو!
دُکھ تو گونگا ہے اذیّت تو نہیں بولے گی

صاف گوئی پہ مری لوگ تو بولیں گے مگر
صاف گوئی پہ ندامت تو نہیں بولے گی

بھوک کا مارا ہوا اور رات کا جاگا ہوا

پھر چلا روزی کمانے جسم یہ لوٹا ہوا

ہاتھ پہنچاؤں میں کیا دو وقت کی روٹی تلک

اس کے میرے درمیاں ہے فاصلہ بڑھتا ہوا

بے زباں تھے کہ غمِ عشق کے مارے چُپ تھے
ہم محبّت میں زمانے سے جو ہارے چُپ تھے

چشمِ نم، آہ، تمنّا، دلِ آشفتۂ نوا
مرگِ اُمّید پہ جو لوگ تھے سارے چُپ تھے

لغزشیں راس ہیں اب مجھ کو سہارے والو
تھی سہاروں کی ضرورت تو سہارے چُپ تھے

ڈوبنے والے تو دے دے کے صدا ڈوبے تھے
تھی کناروں کی سیاست جو کنارے چُپ تھے

اِک ہمیں ہم تھے زمانے میں غزل خواں ورنہ
چوٹ جن جن کے لگی دِل پہ وہ سارے چُپ تھے

شکستگی سے نہ پاؤں کے آبلے سے مِلا
مِلا جو رنج تو اِک مُڑتے قافلے سے مِلا

تمہارے بعد تو ہر اِک نے ہاتھ کھینچ لیا
مِلا جو درد کبھی ہم سے تو فاصلے سے مِلا

اُس نے پُوچھا تو فقط دَرد کا افسانہ کُھلا
کِسی صُورت بھی نہ رازِ دلِ دیوانہ کُھلا

ہر نفس پائے جُنوں کیلئے زنجیرِ گراں
کُو بکُو پھِرتا رہا پھر بھی یہ دیوانہ کُھلا

جل کے مرتے ہیں پہ اظہار کے شعلوں میں نہیں
حادثہ یوُں بھی ہُوا ، شمع سے پروانہ کُھلا

ہجر کی رات ڈھلی صبح کے سَاغر میں مگر
نیند آئی نہ تری دِید کا میخَانہ کُھلا

کیسے بھُولوں، مجھ کو لگے
جیسے میرا اِسم ہے وہ

اُس کو قُدرت سے شِکوہ ہے
ایک علیحُدَہ جِسم ہے وہ

رنگ و بو ہیں گُل جیسے ہی
شادابی میں قِسم ہے وہ

مِلتا ہے تو کھُلتا بھی ہے
پھر بھی ایک طِلسم ہے وہ

مُنہ میں چبا کر سُورج کو جب شام نے اندر نِگلا تھا
وہ سایا مُجھ ایک کھنڈر سے مِلنے گھر سے نِکلا تھا

نرم ہَوا جب پاس سے گُزری برگد نے ماری پھُنکار
اندھیارے میں جو رستہ تھا کُنڈلی مار کے بیٹھا تھا

بوڑھے فلک نے اپنے حرم میں کر رکھّی تھیں پریاں قید
پھر بھی اُفق کو پھاند کے اِک دُمدار سِتارہ اُبھرا تھا

چاند سے بدلی مِل کر خُوش تھی اُس کو یہ معلُوم نہ تھا
اُس کے اپنے آنچل میں بھی چاند بہت گہنایا تھا

آتی جاتی روشنیاں کرتی تھیں اُس کا سینہ چاک
ریل کا پُل نِھارہ رہ کر وہ دہاڑیں مار کے روتا تھا

پھیل چُکی تھی سارے بدن پر اِک جنگل کی پاگل آگ
اگلے جنم کی گھُٹّی پی کر اندھا پربت سویا تھا

کب نقائص نہ نظر آئے ہمیں اوروں میں
کب تعصّب نہ ہُوا رِزق رسانِ مذہب

لوگ مِلتے تھے بہم، فاصلے اِتنے تو نہ تھے
تنگ دِل تھا نہ کبھی اِتنا جہانِ مذہب

شہر میں دیکھ رہا ہوں کہ بچھیں ہیں لاشیں
آج ہر شخص ہے لقمہ بہ دہانِ مذہب

ایک سوا ایک

حُکمراں ہوتا تری دولت پہ گر عام آدمی
تیری مخفی دولتوں کے سارے لوکر توڑتا
یہ نظامِ زر ہے ورنہ شہر کے سرمایہ دار!
دھوپ میں بیٹھا سڑک پہ تو بھی پتھر توڑتا

ٹوٹ کر سُورج گرے، راتیں کہاں جھلمل ہُوئیں
نیند آنکھوں میں کہاں، بیداریاں بوجھل ہُوئیں

ہم تو سمجھے تھے نکل آئے رسیّہ صدیوں سے ہم
آج لیکن پھر وہی تاریکیاں نازل ہوئیں

سَر پھرا تھا اک شرر، پھُونک دی ساری فضا
پھر تو سَب پاگل ہوائیں رقص میں شامل ہوئیں

اِس زمانے میں کھُلا ہم پر بڑوں کا چھوٹا پن
لوگ بُزدِل تھے مگر اب عظمتیں بُزدل ہوئیں

بن گیا ناسُور دِل کے اُس عِلاقے میں جہاں
مصلحت کے زیرِ سایہ حسرتیں گھایل ہوئیں

وہ تعلق ذبح کرنے کے لئے ملنے لگا
پھر تو اُس سے جو مُلاقاتیں ہُوئیں، بسمل ہوئیں

یُوں تو گذرتی جائے شام
ہم پہ ٹھہرتی جائے شام

تیز نہ تھی یُوں دِن کی دھار
دِل میں اُترتی جائے شام

چاک گریبانی کیا خوب
اور سنورتی جائے شام

پَل میں پہنچنے والا چاند
کیوں نہ نکھرتی جائے شام

سوچ کے کاٹوں کچھ تو رات
بات تو کرتی جائے شام

توڑ کے اپنا ہی سُورج
مانگ میں بھرتی جائے شام

طوفاں میں روکنا نہ سفینہ پُکار کے
اندر اُتر چلا ہوں شبِ انتظار کے

کوئی بھی خواب جسمِ محبّت نہ لے سکا
دھوکے بھی کھا کے دیکھ لئے اعتبار کے

نکلا نہ دِل سے درد کا کانٹا لگا ہُوا
رگ رگ کُرید بیٹھے ہیں نشتر اُتار کے

کوئی بھی غم نہ تھا ہمیں جب زندگی نہ تھی
تُم کیا مِلے کہ مِل گئے غم روزگار کے

ہر حادثہ سمجھ کے محبّت کا حادثہ
دُنیا میں جی رہا ہوں مَیں دُنیا سے ہار کے

کوئی ہَوس تو مِٹتی دلِ غم پسند کی
کرنا ہی تھا تباہ تو کرتے سنوار کے

کبھی ہونے سے کبھی دُکھ کے نہ ہونے سے ہُوا
اے محبّت تجھے بس کام ہی رونے سے ہُوا

خُود ہی لَوٹ آئے تو لَوٹ آئے مِرے دیدۂ تر!
کوئی زنجیر کہاں اشک پرونے سے ہُوا

وہ تو رہتا ہے کہیں دِل کے اندھیرے میں مگر
مُجھ پہ روشن ہُوا جو کُچھ اُسی کونے سے ہُوا

اُس کا ممنون ہوں اب، جس نے بھَنور میں چھوڑا
اِتنا گہرا کبھی تو میں اُس کے ڈبونے سے ہُوا

وہ جب گیا تھا حادثہ ایسا ہُوا نہ تھا
مُجھ سے بچھڑ گیا تھا وہ مُجھ سے کٹا نہ تھا

اُس کے بدلنے میں تھیں زمانے کی سازشیں
اُس پر ہُوا تھا فیصلہ اُس نے کیا نہ تھا

اُس کا کرم کہ اُس نے فقیروں کو غم دِیا
پھر کوُ بکوُ گئے تو یہ در بھی کھُلا نہ تھا

کِتنے وثوق سے وہ مِرے غم پہ ہنس گیا
رو رو کے جیسے مُجھ سے کبھی بھی مِلا نہ تھا

اُس ہاتھ میں حِنا کی لکیریں تھیں مَیں نہ تھا
مَیں وہ بھی پڑھ گیا جو کہیں بھی لکھا نہ تھا

اب تک ہوں بے حسنم مَیں، تعارف بھی دوں تو کیا
تیرا ہی اِک عقیدہ جو تُو نے جیا نہ تھا

ہجر کا تیشہ لگا دریا مگر پھوٹا نہیں
میں کہ پتھر ہو چکا اب کیا عجب رویا نہیں

کٹ گئی ہے رات تو دونوں کی لیکن فرق ہے
وہ ابھی جاگا نہیں ہے میں ابھی سویا نہیں

شہر میں دہشت ہے وہ ، بہتے لہو کو دیکھنے
کچھ دِنوں سے مَیں تو کیا سورج کہیں نکلا نہیں

اُس کی باتیں خوبصورت ، ہم پہ اِک تاروں کا جال
کلمۂ مقصد کشا اُس چاند سے اُترا نہیں

مانگ کر اُس کو زمانے سے ، خطا مجھ سے ہوئی
دہر میں چھینے بِنا حق تو کبھی مِلتا نہیں

کچھ لوگوں کے آدرشوں میں جعلی گنگا بہتی ہے

جیون رس کی بوند نہیں ہے خالی گنگا بہتی ہے

دن میں منچ سجا کر جو کردار کی باتیں کرتے ہیں

اُن کی رات تھرکتی ہے متوالی گنگا بہتی ہے

یہ گنگا تو شُدھ ہے پھر بھی اُس گنگا کی بات کرو

نیچے سے اوپر کی طرف جو کالی گنگا بہتی ہے

اے سوکھے کے مارے لوگو! بات ہے کیا یہ دیکھو تو

دُور نہیں وہ کھیت جہاں ہریالی گنگا بہتی ہے

تیرے غم میں دُنیا کا غم آ کر گھُل مل جاتا ہے

اب تو میری آنکھ سے بھی مٹیالی گنگا بہتی ہے

سچ ہے ترا نظام بڑی مشکلوں میں تھا
میں کاغذوں میں تھا نہ تری فائلوں میں تھا

جس چُپ کی دیکھ ریکھ میں مَیں قتل ہو گیا
اُس چُپ کا نام تک نہ کہیں قاتلوں میں تھا

یہ ہاتھ تو کٹے تھے زباں بھی کٹی جہاں
ایسی مشین پر تھا میں ایسے مِلوں میں تھا

اِک مُجھ بُجھے بُجھے سے بھی تجھ کو دھواں لگا
جلنے کا اِذن بھی نہ تِری محفلوں میں تھا

سمجھا ہوں اب کہ راہ دِکھاتا تھا کِس لئے
وہ مجھ کو تنہا چھوڑنے کی منزلوں میں تھا

صحرا کو کیا مِلے جو سمندر سخی بھی ہو
وہ شخص موجزن تھا مگر ساحلوں میں تھا

محل کھڑا ہے یہ جھونپڑوں میں، یہ فرق اِتنا عجیب کیوں ہے
اگر ترقّی پہ مُلک ہے تو غریب اتنا غریب کیوں ہے

ہم اپنے چارہ گروں کے دَر پر بِلک بِلک کے یہ پوچھتے ہیں
یہ موت پہلے جو موت سے ہے یہ موت اپنا نصیب کیوں ہے

یہ جب بھی لائے تو ہم کو لائے ہیں قتل وغارت کے راستے پر
تو پھر یہ مندر ہے سارتھی کیوں حرم ہمارا نقیب کیوں ہے

یہ کیسی آزادیاں ملی ہیں کہ چُپ رہیں ہم یا جھُوٹ بولیں
یہ حق کُشائی کے راستے میں قدم قدم پر صلیب کیوں ہے

ہمارے حق میں جو فیصلے ہوں بدل کے رکھ دے یہ دولتوں سے
کبھی جو پوچھو تو ہم بتائیں امیر اپنا رقیب کیوں ہے

حق تھا، بخشش بھی نہ دی گو التجا ہم نے بھی کی
مانگ کر اُس کو زمانے سے خطا ہم نے بھی کی

یُوں نہ سمجھو اُٹھ کے یُوں ہی آ گئے چارہ طلب
بن پڑی جو کچھ بھی اِس دِل کی دَوا ہم نے بھی کی

وہ بھی اب آنگن مقیّد، ہم بھی اب بے بال و پر
تھا جب اپنا آسماں سیرِ فضا ہم نے بھی کی

اُس خدا نے جانے کیا مانگا خدائے دہر سے
ہوا اثر اُس کی دُعا میں یہ دُعا ہم نے بھی کی

سچ تو یہ ہے ہو گئے ہم اپنی قدروں کے شِکار
یُوں وفا تم نے بھی کی ہے یوں وفا ہم نے بھی کی

عُمر کے نیچے دَبے ایسے کہ دَبتے ہی گئے
قسط اِک اِک سانس کی یوں تو ادا ہم نے بھی کی

ستم تھا آسماں، قوسی اداؤں کے بھی پر نکلے
تھی کم کیا سادگی جو اَب قباؤں کے بھی پر نکلے

کہاں تھی یہ سُبک گامی کبھی سانسوں کی آہوں کی
چھُوا وہ عارضِ گُل تو ہواؤں کے بھی پر نکلے

قیامت پر قیامت ہے یہ فتنہ خیز انگڑائی
تھیں جتنی پر سمیٹے اُن بلاؤں کے بھی پر نکلے

مرے بے آشیاں ہونے سے کانٹوں کی زباں نکلی
ہنسی اُڑنے لگی بے پر صداؤں کے بھی پر نکلے

تمہیں رکھنا نہ تھا بارِ روایت سوچ پر اپنی
جب اُڑنا ہو گیا مشکل خطاؤں کے بھی پر نکلے

یہ کچھ حرف آشنا اُس سے نہ اُلجھیں ان کو سمجھاؤ
نکل سکتے نہ تھے بل تو خُداؤں کے بھی، پر نکلے

شعلۂ آہ مِرا سَرد بھی ہوتا کوئی
تیری پلکوں پہ جو ہمدرد بھی ہوتا کوئی

یہ بھی کیا زخم دیا ہے کہ ہُوا ہوں بے حس
کاش اس چوٹ سے کچھ دَرد بھی ہوتا کوئی

اپنے بے رنگ تبسّم کو سجاتا میں بھی
زیست کا رنگ اگر زرد بھی ہوتا کوئی

وہ کہ ہر شخص کو دَریا بیں بَدلتا گُذرا
اُس کی راہوں میں کہاں گرد بھی ہوتا کوئی

بے وفاؤں کی میں فہرست بناتا کیسے
نام پیارا سا سَرِ فرد بھی ہوتا کوئی

دردکی ہستی جاوید میں ڈھلنا تھا اُسے
ایک لمحہ تھا یہ صدیوں میں بدلنا تھا اُسے

ہو گیا گُم وہ کہیں شام کے سُورج کی طرح
وہ مُسافر تھا بہت دُور نِکلنا تھا اُسے

دمِ رُخصت ہی بہاتا سبھی آنسو کیسے
گھر پہنچ کر بھی بڑی آگ میں جلنا تھا اُسے

لاکھ دیتا رہا گُل ریز بُلاوے کوئی
اپنے انفاسُ کے کانٹوں ہی پہ چلنا تھا اُسے

زندگی تُو نے محبّت کو بھی بے برگ کیا
وہ تھا غُنچہ، ترے رُخسار پہ کھلنا تھا اُسے

وہ دشمنِ دل و دیں ہے تو چاہ کیسے ہُوئی
جنابِ شیخ یہ خوئے گُناہ کیسے ہُوئی

بصد غرور اُٹھاتے رہے ہیں جی کا ضرر
نہ پُوچھ اب ترے غم سے نباہ کیسے ہُوئی

نگاہ کر گئی صحت کو طُور یُوں کیسے
کسے بتائیں جوانی تباہ کیسے ہُوئی

بڑھے جو تجھ سے مراسم تو ایک زحمت بھی
ملے ہے جو وہی پُوچھے نگاہ کیسے ہُوئی

بس اِس خطا پہ ہمیں کر دیا گیا مصلُوب
کہ گھُٹ رہا تھا اگر دم تو آہ کیسے ہُوئی

پرائے غم کی کہانی حسین لگتی ہے
مری غزل تھی مگر واہ واہ کیسے ہُوئی

پلکوں کی مُنڈیروں پہ جلائی ہے اُداسی
ھر شام محبّت نے مَنائی ہے اُداسی

ہنس ہنس کے زمانے سے چھُپائی ہے اُداسی
ہم نے بڑی محنت سے کمائی ہے اُداسی

کیوں آج اُچھالوں نہ مَیں کچھ ساغرِ لبریز
تنہائی نے مہمان بنائی ہے اُداسی

اُس حادثۂ شوق کو مُدّت ہوئی گزُرے
اب تک در و دیوار پہ چھائی ہے اُداسی

ہے دُور بہت دُور ترا شہر جہاں سے
اُس دشت میں اب ہم کو لے آئی ہے اُداسی

چونکا دیا کس خواب پریشاں نے اِسے پھر
کِس یاد کی دستک نے جگائی ہے اُداسی

افسردہ نہیں صِرف شبِ ہجر کا چہرہ
اب وقت کی رگ رگ میں سمائی ہے اُداسی

کہتے ہو تو یہ عیش بھی ہم چھوڑ دیں ورنہ
اِک عُمر گذاری ہے تو پائی ہے اُداسی

کیوں جُوئے رواں آ کے یُوں آنکھوں میں کھڑی ہے

لگتا ہے پہاڑوں پہ کہیں برف پڑی ہے

اے درد کبھی اُٹھ بھی سہی تنگیٔ دِل سے

مدّت سے درِ دل پہ کوئی یاد کھڑی ہے

منزل کو چلے یا کسی مقتل کو چلے ہیں
ہر راہ یوُں لگتی ہے کہ زنجیر پڑی ہے

یوُنہی تو نہیں بیٹھ گئے جھاڑ کے دامن
محرُومیِ تقدیر سے اُمّید بڑی ہے

دو دن کی محبّت نے دی یہ ہستیِ جاوید
اِک پل بھی نہیں کٹتی ابھی عمر پڑی ہے

یوُں ہم نے نکالی ہے تری راہِ مُلاقات
یوُں ہجر ترے دید کی برکت کی گھڑی ہے

ہر صبح تری چشمِ فسُوں ساز کا غمزہ
ہر شام ترے لب سے ہنسی پھوٹ پڑی ہے

دِن ہے تو ہے مہکا ترے رُخسار کا غازہ
شب ہے تو تریِ مانگ ستاروں سے جڑی ہے

آ گئے تم تو جفاؤں کا تعلق یاد نہیں
دِل وہ بچّہ ہے جسے پہلا سبق یاد نہیں

کیا بتائیں کہ تھی کیا صبحِ ازل وہ صورت
اِس کڑی دھوپ میں عارض کی شفق یاد نہیں

جانے کِس گام کھُلیں اُس کے تبسّم کے رموز
آ چکے کتنے ہی نیرنگِ اُفق یاد نہیں

عمرِ رفتہ میں ترا نام بھی لکھّا تھا کہیں
لے گیا کون اُڑا کر وہ ورق یاد نہیں

جبرِ دُنیا میں وہ کالج کا زمانہ بھُولا
تھے کتابوں میں لکھے کون سے حق یاد نہیں

جنگ سے مسئلے حل کرنے چلے ہو لوگو!
تمہیں تاریخ کا ایک ایک سبق یاد نہیں؟

اُس نے لکھا، خط دانائی میں ڈوب کے لکھنا
اپنی عادت گہرائی میں ڈوب کے لکھنا

سامنے کا یہ پیار نہ ہو تری اک کمزوری
دِل میں کیا ہے تنہائی میں ڈوب کے لکھنا

آج تو خوش ہو کر لکھّا انجان نگر ہے
کل کا حال بھی رسوائی میں ڈوب کے لکھنا

تم کیا جانو لکھتا ہُوں تم کو کیوں کم خط
بہت کٹھن ہے یاد آئی میں ڈوب کے لکھنا

وہ شرمیلا کیسے لکھّے پیار ہوس ہے
ہمّت مانگے سچّائی میں ڈوب کے لکھنا

حُسن اپنا کھو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی
چاندنی تھی، ہو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی

پیار کا آنچل تو بس اِک پھٹا بادل سا ہے
اپنی سُدھ بُدھ کھو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی

ہم کہ تھے بیمار، ہونا تھا ہمیں تو زرد زرد
وہ نظر کیوں ہو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی

رو رہی تھی کب سے کر کے اپنے کمرے کو سیہ
گھر نے سمجھا سو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی

ہنس پڑے تو یوں لگے، تاروں کے چھینٹے مار کر
رات کا مُنہ دھو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی

دوستوں سے مِل رہا ہوں صبحِ خزاں کی طرح
اور دِل میں رو رہی ہے زرد مدّھم چاندنی

دیوار، در نہیں ہے قیامت ہے
صحرا میں گھر نہیں ہے قیامت ہے

رستہ نکل گیا مرے پاؤں سے
عمرِ سفر نہیں ہے قیامت ہے

اک محشرِ خیال ہوں میں تجھ بن
اس دھڑ پہ سر نہیں ہے قیامت ہے

مدفن سے جی اٹھا ہوں میں پھر اپنے
اُس کی نظر نہیں ہے قیامت ہے

یہ حسرتوں کی مری خاک سے نمو کیا ہے
ترے بغیر یہ دُنیائے رنگ و بُو کیا ہے

تُو یوں بھی ساتھ مرے، جاں بلب جدائی میں
وگرنہ یہ جیئے جانے کی آرزو کیا ہے

تمہاری یاد سے بڑھ کر کریں عبادت کیا
بہے جب آنکھ سے خود ہی تو پھر وضو کیا ہے

سنبھل کے یُوں وہ نئے ہم سفر کے ساتھ چلا
کبھی نہ اُس کو بتایا کہ جستجو کیا ہے

میں آج اپنے مسیحا سے کٹ کے آیا ہوں
مرا علاج بتا میرے چارہ جُو کیا ہے

لہو تو وہ کہ بہے جب تو نقشِ یار بنے
نہ اپنا رنگ جمائے تو پھر لہُو کیا ہے

یہ کہہ رہا ہے چاند، یہی اجتماعِ شب
تُو بھی ہو اب طلوع تو ہو ارتفاعِ شب

اُس کا یہ مجھ سے آج نہ ملنا تو کچھ نہیں
یہ شام دے رہی ہے مگر اطّلاعِ شب

اشکوں سے لے رہا تھا چراغاں کا کام میں
اب تو مگر ہے لُٹ چکی وہ بھی متاعِ شب

یوں بھی نہیں کہ مجھ کو اندھیرا دکھائی دے
اب گُل ہے عرشِ یاد پہ اِک اِک شُعاعِ شب

اِک کی تلاش میں رہی دُوجے سے دوستی
خُوش آمدیدِ صبح کہوں یا وِداعِ شب

ہوتے جو دن بُرے بھی ہیں ہنس کر گزارتا
بختِ سیہ نے مجھ سے کیا اختراعِ شب

بات اُس کی ہو تو آدابِ نوا بھی رکھنا
بُوئے گُل دِل میں ہو تو لب پہ صبا بھی رکھنا

ہم نے اس آگ میں جانا کہ ہے کتنا مُشکل
خاک ہو جانا مگر خود کو بچا بھی رکھنا

ہم سے مِلنا ہو اگر صرف اکیلے مِلنا
اپنی فِطرت ہی نہیں بیچ خُدا بھی رکھنا

کھود لیتے ہیں کھنڈر لوگ خزانے کیلئے
دِل میں مُشکل ہے ترا پیار دبا بھی رکھنا

اب ترستا ہوں تری یاد میں رونے کیلئے
کچھُ نہ کچھُ رنج تو لازم تھا اُٹھا بھی رکھنا

بے تخلص سبھی سب سُن کے غزل جان گئے
اُس کو آیا نہ مِرا درد چھُپا بھی رکھنا

کہوں مَیں کیسے بظاہر سبھی کے ساتھ رہا
اُسی کو فرض کِیا تب کِسی کے ساتھ رہا

مُجھے اصولِ مساوات کر گیا تنہا
مرا قصوُر یہی تھا سبھی کے ساتھ رہا

جو زِندگی تھی گئی جانِ زندگی کے ساتھ
میں زندہ رہ کے کسی اجنبی کے ساتھ رہا

تھا روزگار کا غم ہی جو در بدر بھٹکا
تمہارا غم تو غنی تھا خودی کے ساتھ رہا

میں خود کو کوستا رہتا ہوں اب یہ کہہ کہہ کر
تُجھے ہی عشق نہ دیوانگی کے ساتھ رہا

اب اُس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں بعد منزل کے
جو ایک مَیں مری آوارگی کے ساتھ رہا

نقشِ دیوارِ شکستہ ہی کہیں ہو مجھ میں
درد ہو ، یاد ہو ، کوئی تو مکیں ہو مجھ میں

اِک جزیرہ ہوں نہ خوانِ تمنّا کب سے
پاؤں رکھنے کے لئے کچھ تو زمیں ہو مجھ میں

خُون باقی ہے تو پھر زخم سے باہر آئے
رنگ دکھلائے جو اِک بوند یقیں ہو مجھ میں

میں ترے غم کی امانت کو سنبھالے رکھوں
سانس کوئی تو مگر میرا امیں ہو مجھ میں

مجھ سُلگتے ہُوئے جنگل پہ ہے چڑھتی آندھی
لَوٹ جائے جو کبھی اب گوشہ نشیں ہو مجھ میں

تھا بھلانا جنھیں پھر بھی وہی غم یاد آئے
ہم ملے بھی تو زمانے کے سِتم یاد آئے

کارِ دُنیا میں نہ شبنم ہے نہ عنبر نہ گلاب
دہر دیکھا تو تری زُلف کے خم یاد آئے

یاد کرکے تمھیں، رونے کا زمانہ بھی گیا
آج رویا ہُوں تو سمجھا ہُوں کہ تم یاد آئے

بھر کے جھیلوں کو چلا جاتا ہے ساون جیسے
اِس طرح یاد ہے وہ شخص جو کم یاد آئے

یہ تو سچ ہے تھا مرے لب کے قریں اور گلاب
یہ بھی سچ ہے مجھے اُس وقت بھی تم یاد آئے

ایک مُلاقات اور وہی سوغات بچھڑنے کی
اُس نے ہم سے بات تو کی پر بات بچھڑنے کی

اچھّے دِن تھے یا تھے بُرے دِن، دِن تھے اُسکے ساتھ
عُمر کو کر گئی کالی رات، اِک رات بچھڑنے کی

رو پڑتا تو لوگ لگاتے تم پر سو الزام
سامنے سب کے مَیں نے رکھ لی بات بچھڑنے کی

باہر، چہرہ تھا سہاگن کی ہنستی ہنساتی دھوپ
اندر اندر ہوتی رہی برسات بچھڑنے کی

دِل ٹوٹا تو کٹتے گئے ہر ایک محاذ پہ ہم
ہر اِک جنگ میں کام آئی اِک مات بچھڑنے کی

انسان تھا تو دہر میں معبود تھا خُدا
پھر اُس کے بعد ہر کوئی نمرود تھا خُدا

اَوتار تھے جو آگ کے ہتھیار بن گئے
آتش زنی سے اُٹھتا ہُوا دود تھا خُدا

جنگل میں تھا تو غازیٔ تیر و تُفنگ تھا
شہروں میں آ کے موجدِ بارود تھا خُدا

جب بھی مِلے وہ راہ میں خنجر بکف مِلے
وہ لوگ جِن کی منزلِ مقصود تھا خُدا

مندر بنے کہیں اُس کے کہیں مسجدیں بنیں
جیسے کسی حصار میں محدُود تھا خُدا

کیا کہیں کس کس کی رحمت ہے ہماری سوچ پر
ہر بڑی طاقت کو قدرت ہے ہماری سوچ پر

بھوک ہے اور اُس پہ ہے بے مغز قدروں کی غذا
اِک مصیبت، ایک لعنت ہے ہماری سوچ پر

اہلِ زر کب ہاتھ سے کھائیں گے کر کے، جب تلک
گھر، زمیں کی یہ وراثت ہے ہماری سوچ پر

چند سرمائے کے ہاتھوں میں رہے گا یہ نظام
جب تک اپنی اپنی دولت ہے ہماری سوچ پر

سب دلیلیں آتما پرماتما پر ختم ہیں
دیوتاؤں کی حکومت ہے ہماری سوچ پر

پتھر کو کوئی نیند کا جھونکا نہ آئے گا
اب کے لگی بھی آنکھ تو سپنا نہ آئے گا

لو ہو چلا ہے دل کو خطاؤں پہ ناز اب
اب شام کو بھی صبح کا بھولا نہ آئے گا

میرے لہو کا رنگ تھا دامن پہ چڑھ گیا
قاتل کو تھا گمان کہ چھینٹا نہ آئے گا

اندر ہی توڑ ڈالا کناروں کو ضبط نے
اب جاؤ گے تو راہ میں دریا نہ آئے گا

میں ڈوب تو گیا ہوں مگر تہ کو پا گیا
پانی تلے سفر میں کنارہ نہ آئے گا

چار دیواری کا ہر پتھّر تھا بُنیاداً غلط
مَیں مُقیّد ہو گیا تھا گھر تھا بُنیاداً غلط

یُوں تو دِل نے کیں تِرے بِن بھی خیال آرائیاں
عِشق تیرا بے بدَن ہو کر تھا بُنیاداً غلط

ہم مِلاتے کب تلک دیوار کے اوپر سے ہاتھ
یُوں تِرا مِلنا آنا پرَور ! تھا بنیاداً غلط

یُوں بھلے لوگوں سے بھی ہوتا یہاں کِس کا بھلا
بات یہ تھی یہ نظامِ زر تھا بُنیاداً غلط

شہر میں بن کے محبت کا گدا گر مانگوں
مجھ کو مانگے سے ملے وہ تو میں در در مانگوں

دہر کی دار پہ جھولوں بھی تو کیسے جھولوں
غمِ دنیا بھی ترے قد کے برابر مانگوں

اک طرف دل کہ ترے غم سے ابھرتا ہی نہیں
اک طرف میں کہ تری دید کا گوہر مانگوں

تیری یادوں کی اڑانیں بھی بہت خوب مگر
دل یہ کہتا ہے ترے لمس کا شہپر مانگوں

زندگی میری ہے کشکولِ تہی کی صورت
اس بھکاری سے میں مانگوں بھی تو کیا زر مانگوں

ایک پتھر ترے راہوں سے ہٹا ہوں جب سے
آج یہ حال کہ ہر پاؤں سے ٹھوکر مانگوں

سر زنی کی ہے دو ہاتھوں سے مشقّت کی ہے
چوٹ دیکھو تو محبّت نہیں محنت کی ہے

زندگی! تُو ہی مِلی ہم کو مزارِ خاموش
ہم نے تو آکے تری پھر بھی زیارت کی ہے

چلو ہم تو نہ تھے حقدارِ محبّت تیرے
یہ بتا کس پہ زمانے میں عنایت کی ہے

اُن کے بھی ناز اُٹھائے نہ تھی کچھ جن سے غرض
اور پھر تم نے تو اِس دِل پہ حکومت کی ہے

منحرف کیا ہُوا دم ساز ہمارا ہم سے
اپنی سانسوں نے بھی اب ہم سے بغاوت کی ہے

مر مِٹے تیرے قد و گیسو پہ ہم، کیا حیرت
یوں بھی ہم نے تو صلیبوں کی ہی خدمت کی ہے

زندگی اپنی ہُوئی یار کی فطرت کی طرح
ہم بھی کل ہوں کہ نہ ہوں اُسکی عنایت کی طرح

وقت ہم کو یہ بُرے دِن نہ دِکھاتا اے کاش!
ہم بھی اُٹھ جاتے زمانے سے محبّت کی طرح

ہم تو ہر لمحے کو دیتے رہے سانسوں کا حِساب
ہم پہ ٹوٹا ہے ہر اِک لمحہ قیامت کی طرح

گُل کھِلائے گا یہ مقتول لہو دھرتی پر
کِسی رُخسار پہ چڑھتی ہُوئی رنگت کی طرح

لوگ کہتے ہیں نہ کیوں بھول گیا میں اُسکو
وہ کہ تھا جو مری بُنیادی ضرورت کی طرح

زندگی! تُو کِسی ساغر میں ڈھلی تو ہوتی
ہم تو پی لیتے تجھے جامِ شہادت کی طرح

کیا خبر اشک ہی اندر سے علیحدہ کردے
ایک دِل کے پری پیکر سے علیحدہ کردے

وہ تری یاد تھی جس نے ہمیں یکجا رکھا
دُکھ وہ دُکھ تھا کہ عناصر سے علیحدہ کردے

وہ نہیں ہے سچ تو یہ عمرِ رواں کہتی ہے
کیا چلوں جب کوئی محور سے علیحدہ کر دے

اب جو ٹوٹا ہوں تو اُس آنکھ کا جادو سمجھا
وہ تو چنگاری بھی پتھر سے علیحدہ کر دے

کیا کہوں اُس سے بچھڑنے کی اذیّت کیا ہے
جیسے گردن ہی کوئی سَر سے علیحدہ کر دے

ایک مُدّت سے غمِ دہر ہے اشکوں میں گھُلا
آ کے یہ ریت سمندر سے علیحدہ کر دے

ایک مظلومِ زمانہ ہوں میں بدبخت نہیں
غمِ دُنیا کو مُقدّر سے علیحدہ کر دے

تنگ صحرا ہے جو اندر یہ طلب ہے اُس کی
در و دیوار کو اب گھر سے علیحدہ کر دے

اُسے دیکھوں کہ میں زخموں کا وہ منظر دیکھوں
نگہِ شوق ! اُسے منظر سے علیحدہ کر دے

☆ فارسی تلفّظ بروزنِ مفاعلن کے بجائے ہندی تلفّظ بروزنِ فعولن

ملتی ہے بار بار ملے غم سے زندگی
لیکن کبھی ملے تو سہی ہم سے زندگی

دُنیا کے غم تھے پہلے کہاں اتنے دلفریب
ہر غم کو مل گئی ہے ترے غم سے زندگی

تھی زندگی عزیز مگر اُس کے واسطے
مانگی نہ جس نے بھول کے بھی ہم سے زندگی

اپنے لئے تو یہ بھی گرہ در گرہ رہی
ملتی ہے تیری زُلف کے ہر خم سے زندگی

چہرے کے ریگ زار میں رونق اُگا گئی
اُتری کبھی جو دیدۂ پُرنم سے زندگی

تتلی تھی ایک غنچہ دہن، گُل عذار کی
اُس کو نہ پا کے اُڑ گئی موسم سے زندگی

وہ غم کی ابتدا تھی مگر انتہا ہے یہ
پہلے تھا زندگی سے غم اب غم سے زندگی

شہر سے چل تو پڑیں سُوئے بیاباں راہیں
خارزاروں میں ہُوئیں چاک گریباں راہیں

ساتھ اُس کا تھا تو جنگل بھی رہے راہ کُشا
اُس سے بچھڑے تو ہُوئیں ہم سے گریزاں راہیں

پڑ گئیں عُمر سے پہلے ہی جبیں پر جُھریاں
جیسے رَوندی ہوئی کھیتی میں پریشاں راہیں

ضبط نے روک کے دیکھے ہیں بہت بار یہ اشک
آپ ہی آپ بنا لیتی ہیں ندیاں راہیں

میں تو اِک موڑ پہ چھالے کی طرح بیٹھ گیا
ہو سکیں کاٹ کے مُجھ کو بھی نہ آساں راہیں

ہم نے دیکھا ہے بدلتی ہُوئی راہوں کا مزاج
چل پڑیں خُوش، دو گھڑی ہو کے پشیماں راہیں

جانے کب سَر ہوں سلاسل کے مراحل یارو
گیسُوئے یار سے پہنچیں پسِ زنداں راہیں

محرومِ رزق یاد نہ یُوں کر اے زِندگی!
موجُود سے ہو کچھ تو میسّر اے زِندگی!

چھوڑ آئی کِس کو راستے میں کچھ خبر بھی ہے
وُہ شخص تو تھا تجھ سے بھی برتر اے زِندگی!

شام آگئی ہے رنگِ تعارف تو چھوڑ جا
جانا ہے اپنے اپنے ہمیں گھر اے زندگی!

مُندنے لگی ہے آنکھ، مُجھے دیکھکر بتا
کیسا ہے اب بِگڑ کے مُقدّر اے زندگی!

تیری صدارتوں میں یہ دُکھ ہیں غزل سَرا
مَر مَر کے کہہ رَہا ہُوں مُکرّر اے زندگی!